معارف

نومبر ۲۰۲۰ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپئے ہے۔

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

HAFIZ SAJJAD ELAHI

196 - AHMAD BLOCK, NEW GARDEN TOWN

LAHORE (PUNJAB) PAKISTAN

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org

Website: www.shibliacademy.org

Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh

Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100

✆ (Ma'arif Section) 06386324437

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۶ ماہ ربیع الاول ۱۴۴۲ھ مطابق ماہ نومبر ۲۰۲۰ء عدد ۵

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یو پی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

۲۰۲۰ء کا سال پورا ہونے میں ابھی دو مہینے اور ہیں، لیکن ان دس مہینوں میں خدا کے بندوں پر جو گزری، ماہ و سال کا شمار و حساب کرنے والوں کے لیے اس کا بیان بہت مشکل ہے، کرونا کا عذاب تو بعد کی بات ہے، اس سے پہلے دلی، علی گڑھ بلکہ پورے ہندوستان میں سی-اے-اے اور این-آر-سی کے پردے میں جو قیامتیں ڈھائی گئیں، ان کی وجہ سے یہ سال ایک خوفناک خواب میں بدل گیا لیکن ویرانے میں بہار کی کچھ ساعتیں بھی نکل ہی آتی ہیں، یادوں کے چمن میں بادِ بہاری نے پیغام دیا کہ سو سال پہلے کچھ ایسے ہی ماحول میں سر سیدؒ کے مدرسۃ العلوم نے دار العلوم ہونے یعنی کالج نے یونیورسٹی بننے کا سفر طے کیا، ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں مسلم یونیورسٹی ہونے کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا، کن حالات میں اور کتنے اندیشوں اور وسوسوں کے عالم میں یہ منزل ملی، یہ اس زمانہ کی تاریخ پر نظر رکھنے والے جانیں اور ان ہی جاننے والوں کی مانیں تو عین اسی وقت یعنی اسی ماہ اکتوبر میں مسلم یونیورسٹی کی ایک شاخ اور پھوٹی یا یہ کہیں کہ ایک شاخ ٹوٹی، اب یہ جذبۂ پیدائی تھا یا پھر لذتِ یکتائی کا معاملہ، لیکن ۲۰ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا قیام جن ہاتھوں سے عمل میں آیا ان کی رہنمائی بالکل واضح تھی کہ فیصلہ یہ کرنا ہے کہ ہماری تعلیم اغیار کے اثر سے کلیتاً آزاد ہو، حضرت شیخ الہند کا معیار بھی واضح تھا کہ ہمارے کالج بغداد و قرطبہ کی یونیورسٹیوں کے نمونہ ہونے چاہئیں، سو سال پورے ہونے پر ان لمحوں کا تصور کیجیے جب ملازمتوں کے متلاشی، سفارشوں کے لیے سرگرداں اپنے پیٹ کے علاوہ اور سب حقیقتوں سے ناآشنا نوجوان بیتاب تھے کہ اپنے وجود کو وجود ملی میں گم کردیں، سو سالہ جشن منانے والوں کی سماعت کے لیے یہ الفاظ آج بھی رجزیہ ہوجاتے ہیں کہ ”یہ قافلہ سر و سامان چھوڑ کر بے سر و سامانی کی طرف رواں ہو رہا تھا، یہ وقتی فائدوں کے بدلے وقتی نقصانوں کا سودا کر رہا تھا، اسے عاجلہ کے مقابلے میں آخرۃ زیادہ عزیز تھی، یوں اور اس فضا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام شروع ہوا۔ حقیقتاً جامعہ اسلامیہ کی اصل علی گڑھ کے شجرۂ طیبہ ہی کی ہے، مولانا محمد علی جوہر اگر بانیانِ جامعہ سے ہیں تو وہ فرزندانِ علی گڑھ میں بھی نمایاں ہیں، ان دونوں اداروں کے جشن صد سالہ کی نوعیت الگ ضرور ہے لیکن ان کا مقصد

وجود الگ سمجھا ہی نہیں جاسکتا، مولانا محمد علی جوہر اظہار خیال کی بے باکی میں شاید برصغیر کے مسلمان رہنماؤں میں سرفہرست ہیں، انہوں نے کہنے والی بات کہہ دی کہ ہمارا کعبہ تو علی گڑھ کالج ہی ہے، جامعہ کی زندگی تو ہجرت کی زندگی ہے، دلی میں مہاجرین کی اس بستی پر بعد میں گزری جو گزری مگر چند سال بعد ہی فیصلہ ہوگیا کہ جامعہ کا اصل مقصد تعلیم ہے، سیاسی مقصد محض ضمنی ہے، ہاں طالب علموں میں آزادی کا جذبہ اور قومیت کی روح پیدا کرنا ہے، یعنی جو مقصد بانی مسلم یونیورسٹی کا تھا وہی مقصد یہاں بھی پہلی ترجیح ہی بنا، دلی میں جامعہ ملیہ کے قیام کے صرف تین سال بعد اس وقت ملک کے ممتاز سائنس داں سر پی سی رے نے جامعہ کے مقاصد میں اول آزادی، آخر آزادی اور ہمیشہ آزادی کا ذکر اس طرح کیا کہ راوی کے مطابق در و دیوار اس کی صدائے بازگشت سے گونج اٹھے، سو سال بعد اگر یہی مقصد نعرہ بن کر گونجا تو گویا یہ اپنے مقصد وجود کی تجدید کا اعلان تھا جو موجودہ حالات میں ہر انصاف پسند کے دل کی آواز بن گیا۔

سر سید، شبلی، جوہر، حکیم اجمل خاں، نواب شروانی کے رشتوں کے نہایت خوبصورت اظہار کا گواہ خوش قسمتی سے دارالمصنّفین بھی ہے، شبلی نے علی گڑھ میں قومی بیداری میں اپنے حصہ کا حق ادا کیا تو سید سلیمان ندویؒ نے جامعہ ملیہ کے سنگ بنیاد رکھے جانے کے موقع پر اپنی موجودگی سے اسی شبلوی رشتہ کے تسلسل کا اعلان کیا، سو سالہ ان رشتوں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں مگر دونوں عظیم اداروں کو مبارک باد دیتے وقت معارف کی توجہات کی جانب اشارہ ضروری ہے۔ قریب سو سال پہلے معارف نے جامعہ کے مقاصد کی نشان دہی کے ساتھ لکھا تھا کہ ایک مختصر مدت اس فیصلہ کے لیے کافی نہیں ہے کہ وہ اپنے نصب العین میں کہاں تک کامیاب ہے لیکن خوش قسمتی اس کی یہ ہے کہ ایسے ایثار کرنے والے لائق اساتذہ ہیں جنھوں نے نہایت خوشی سے اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں، جب تک ان کا یہ ایثار، اخلاص اور انہماک باقی ہے، اس کی کامیابی غیر مشکوک ہے، اس وقت معارف نے توجہ دلائی تھی کہ جامعہ، یورپ کے صرف سیاسی استیلا سے آزادی کی تحریک نہیں بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر اس کے دماغی و ذہنی استیلا سے آزادی کی تحریک ہے، اس کو ہر راہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ مستقبل میں یہ پشیمانی نہ ہو کہ غلط راستوں پر چل کر منزل مقصود سے بھٹک گئے،

معارف کا یہی رویہ مسلم یونیورسٹی کے ساتھ رہا، اس کے صفحات گواہ ہیں کہ اس نے ندوہ و دیوبند اور دیگر مدارس اسلامیہ سے فطری قربت کے باوجود یہی کہا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے قیمتی دنیاوی متاع اور ان کے سیاسی زوال کے بعد ان کا سب سے بڑا عملی کارنامہ مسلم یونیورسٹی ہے……وہ صرف تعلیم گاہ ہی نہیں، تربیت گاہ اور مسلمانوں کا تہذیبی مرکز بھی ہے، قومی ضروریات، قومی و ملی احساس اور تہذیبی روایات کا تحفظ ہی اس کے قیام کا مقصد ہے، اسی کا اثر ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم جدید کی تقریباً تمام بڑی شخصیتیں یہیں پیدا ہوئیں، جب جب مسلم یونیورسٹی کو پریشان کیا گیا تو معارف بےقرار ہو گیا، ایک بار اسی حقیقت کا اظہار اس جملے سے کیا گیا کہ صد ہزار نمکدان لے کر ہندوستانی مسلمانوں کی جراحت دل کی پرسش کرنی ہو تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ذکر چھیڑ دیجیے، کیسے کیسے انداز معارف نے اختیار کیے کہ مسلم یونیورسٹی ہندوستانی مسلمانوں کے احساسات کا گل کدہ ہے، یہ ان کے خیالات کا مے کدہ بھی ہے جس کے ساقی بن کر اس کے شیشہ و ساغر کی گردش ان ہی کے ہاتھوں کو زیب دیتی ہے، معارف نے حکومت وقت کو آگاہ کیا کہ اس کے لیے مسلم یونیورسٹی ایک تجربہ گاہ ہے جہاں مسلمانوں کا شیشۂ دل توڑا یا جوڑا جا سکتا ہے، ورنہ ع : ٹھوکر بھی وہی کھائے جو اترا کے چلے ہے۔

افسوس کہ دارالمصنّفین کے ایک شیدائی اور اس کے ذرہ ذرہ سے بےلوث و بےغرض محبت کرنے والے جناب سید حسن رضا عارف ہاشمی کورونا کے دور میں اس خاموشی سے اس دنیا سے رخصت ہو گئے کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہفتوں بعد وفات کی خبر ملی، ایسے شریف، شفیق، وضع دار اب کہاں، پیرانہ سال کے باوجود شبلی منزل آنے جانے کی زحمت کرتے، فقہ جعفریہ پر عامل تھے مگر حنفیوں کی طرح یہاں نماز ادا کرتے، ان کے دو مضامین معارف میں چھپے تو ''کلیات شبلی میں اہل بیت سے محبت'' والا مضمون بہت پسند کیا گیا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے شرف تلمذ رکھتے تھے، اس کا حق یوں ادا کرتے کہ ان کی اور علامہ شبلیؒ کی قبر پر فاتحہ خوانی ضرور کرتے، اللہ تعالیٰ رحمت کا معاملہ فرمائے۔ آمین

مدیر معارف محترم ظلی صاحب کی صحت پہلے سے کہیں بہتر ہے، یقین ہے کہ قارئین معارف جلد ہی پہلے کی طرح ان کے شذرات سے شادکام ہوں گے۔

مقالات

قرآن کریم کے منظوم تراجم: ایک جائزہ

ڈاکٹر فہیم الدین احمد/ ڈاکٹر ہاشمی سید وہاج الدین

ترجمہ ایک مشکل فن ہے اور بالخصوص مذہبی کتابوں کے ترجموں میں مشکلات میں اور بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے اس کا نثر میں ترجمہ یقیناً ایک چیلنج ہے، اسی لیے قرآن کے تراجم کے تعلق سے یہ بات کہی جاتی ہے کہ یہ ترجے نہیں بلکہ ترجمانی ہیں اور آج تک کسی مترجم نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا ترجمہ عین قرآن مجید کی روح کے مطابق ہے۔ جب قرآن کا نثری ترجمہ ہی اس قدر دشوار ہے تو شعر میں اس کا ترجمہ کتنا مشکل ہوگا؟ منظوم ترجمے میں مترجم کی مشکلات دوگنی ہوجاتی ہیں ایک جانب متن قرآن کا تتبع تو دوسری جانب ردیف، قافیہ، وزن و بحر وغیرہ کی کڑی پابندیاں۔ الفاظ کے استعمال میں ذرا سی بھی لغزش مترجم کو کٹھرے میں کھڑا کردیتی ہے۔ اسی لیے بعض محققین نے منظوم تراجم کی بجائے 'منظوم قرآنی مفہوم' کہنے کو ترجیح دی ہے۔

منظوم تراجم قرآنی کے متعلق یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ عام طور پر کسی بڑے عالم دین نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی بنیادی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ترجمہ کا مقصد فہمِ قرآن ہے اور نظم کے مقابلے میں نثر سے یہ مقصد زیادہ بہتر طور پر حاصل ہوجاتا ہے لیکن جن شعرا نے منظوم تراجم کیے ہیں انھوں نے بھی یہ کام قرآن کی خدمت سمجھ کر ہی کیا ہے۔ ان کے پیشِ نظر یہ بات رہی کہ ترجمہ اگر نثر میں ممکن ہے تو نظم میں کیوں نہیں؟ دوسری اہم وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ برصغیر میں شعروشاعری سے عوام کا رشتہ زیادہ استوار رہا ہے۔ شاعری انسان کے جذبات واحساسات کو بہت آسانی سے متاثر کرتی ہے اور نثر کی بہ نسبت نظم کو یاد کرنا بھی آسان ہے۔ برصغیر میں منظوم تراجم کے عمل میں یہی وجوہات کارفرما نظر آتی ہیں۔

اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ ترجمہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی۔

اردو میں قرآن حکیم کے منظوم تراجم کی روایت تقریباً پانچ سو سال قدیم ہے۔البتہ منظوم تراجم سے قبل منظوم تفسیر نویسی کا رجحان ملتا ہے۔اردو میں قرآن کا پہلا منظوم ترجمہ حضرت شیخ بہاء الدین شاہ باجن کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جن کا شمار گجرات ودکن کے اکابر علماء اور صوفیہ میں ہوتا ہے، یہ ترجمہ پرانی گجری اردو میں آٹھویں صدی ہجری کے اواخر یا نویں صدی ہجری کے اوائل میں کیا گیا۔ یہ ترجمہ اس وقت دستیاب نہیں ہے۔ جہاں تک قرآن حکیم کے پہلے مکمل مطبوعہ منظوم ترجمہ کا تعلق ہے تو یہ اعزاز مولانا شمس الدین شائق ایزدی کے ترجمے ''نظم البیان'' کو حاصل ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں یہ پہلا مکمل منظوم اردو ترجمہ ہے جو شائع ہوا۔اس سے قبل عبدالسلام سلام بدایونی کی منظوم تفسیر منصۂ شہود پر آچکی تھی ،لیکن اس کی حیثیت ترجمے کی نہیں بلکہ تفسیر کی ہے۔قاضی عبدالسلام نے قرآن کی اس منظوم تفسیر کا آغاز ۲۹-۱۸۲۸ء میں کیا اور مسلسل پندرہ سال کی محنت سے ۱۸۴۳ء میں اس کو مکمل کیا، اس کا تاریخی نام ''زادالآخرۃ'' ہے۔یہ تفسیر اپنی تکمیل کے چھبیس۲۶ سال بعد فاضل مفسر کی حیات ہی میں جون ۱۸۶۸ء میں مطبع نول کشور، لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

جہاں تک اردو کے منظوم تراجم قرآن کا تعلق ہے اب تک کی تحقیق کے مطابق اردو میں بائیس۲۲ مکمل منظوم ترجمے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔بعض کے تو ایک سے زائد ایڈیشن نکلے۔ان کے علاوہ کئی غیر مطبوعہ مکمل ترجمے بھی ہیں۔ان کے علاوہ مختلف لوگوں نے قرآن کے مختلف اجزا کے بھی منظوم تراجم کیے ہیں۔انہیں ہم جزوی تراجم کہہ سکتے ہیں۔محمد سعید شیخ نے اپنے ایک مقالہ میں مطبوعہ جزوی منظوم تراجم کی تعداد لگ بھگ دو سو سے زائد بتائی ہے۔(۱) اس مقالے میں مکمل اور جزوی دونوں قسم کے منظوم تراجم کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے گا۔

قرآن کے مکمل منظوم تراجم:

۱۔نظم البیان المعروف ''منظوم اردو ترجمہ''،شمس الدین شائق ایزدی: یہ برصغیر ہندو پاک کا پہلا مکمل منظوم ترجمہ ہے۔مولانا روم کی مثنوی کی طرز پر یہ ''منظوم اردو ترجمہ'' نہایت سلیس اور عام فہم ہے۔یہ آٹھ سال کی سخت محنت کے بعد ۱۳۴۲ھ ستمبر ۱۹۲۳ء کو مکمل ہوا۔ترجمہ تین جلدوں میں کریمی پریس، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ ہر جلد دس پاروں پر مشتمل ہے۔صفحات کی تعداد ۲۹۶۶ ہے۔ابتدا میں مترجم نے صرف پہلے پارے کا منظوم ترجمہ ''نظم البیان فی مطالب القرآن'' کے نام سے کیا تھا،

ایک مدت تک وہ اس کام کو جاری نہ رکھ سکے۔ اربابِ علم کے مسلسل اصرار پر انہوں نے ترجمہ کا کام دوبارہ شروع کیا۔

یہ منظوم ترجمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے فرزندان شاہ رفیع الدین وشاہ عبدالقادر کے تراجم کو پیش نظر رکھ کر کیا گیا ہے۔ شائق صاحب خود لکھتے ہیں:

> ''حتی الامکان وحتی الوسع اصل ترجمہ سے زائد الفاظ کا کوئی استعمال نہیں کیا گیا۔ بظاہر جو کچھ الفاظ کسی جگہ کسی ضرورت سے لیے گئے ہیں وہ خاص اسی مطلب کو ادا کرنے کے لیے ہیں۔ وہ بھی خاص الفاظ قرآنی کے الف لام اور تنوینات وغیرہ ہی کے معنی ہیں''۔(۲)

اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا دیباچہ اور حواشی بھی منظوم ہیں۔ فاضل مترجم نے جو منظوم وضاحتی حواشی دیے ہیں انہیں ''فرقانِ حمید'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ اس میں قرآنی آیات کو اس انداز سے لکھا گیا ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ بھی کوئی منظوم کتاب ہے۔ بہر حال اس طرح ایک غلط تاثر پیدا ہوتا ہے جس سے احتیاط ضروری ہے۔

۲۔ نمونہ کلام:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (الحجرات:۱)

اے وہ لوگو! جو کہ ایماں لائے ہو	مانتے ہو جو کتاب اللہ کو
مت بڑھو تم آگے (حد دین سے)	حق کے اور اس کے رسولِ پاک کے
اور رہو عصیاں سے تم بچتے ہوئے	ڈر کر اللہ (کے عذاب اور قہر) سے
واقعی ہے حق تعالیٰ ہی سدا	سب کی سننے والا سب کچھ جانتا

۳۔ وحی منظوم: مولانا سیماب اکبرآبادی: مولانا سیماب اکبرآبادی اردو کے مشہور ومعروف شاعر ہیں۔ ۱۹۴۳ء میں انہوں نے قرآن مجید کے منظوم ترجمہ کی ابتدا کی اور شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو سامنے رکھا۔ بلکہ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ ہی کو نظم کی شکل دی۔ مولانا اکبرآبادی نے اس ترجمہ کو صرف سات ماہ اور نو دن کی قلیل مدت میں مکمل کیا۔ یہ ۹۷۱ صفحات پر پھیلا ہوا ہے، آخر میں ۳۲ صفحات پر

مختلف علماء ودانشوران کی آرا ہیں۔

مولانا نے اس ترجمہ میں حددرجہ احتیاط برتی ہے،ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کی معمولی سی بھی کمی وبیشی یا لغزش نہ رہے۔اس کے لیے انہوں نے مختلف مکتبہ فکر کے علمائے کرام سے اس پر نظر ثانی کرائی جن میں مولانا حسین احمد مدنی،مولانا سعید احمد اکبرآبادی،مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاری،خواجہ حسن نظامی،مولانا عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

مولانا حسین احمد مدنی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''ماشاءاللہ نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتا ہے۔حضرت ناظم صاحب (سیماب اکبرآبادی) موصوف نے اکابر اسلاف رحمہم اللہ تعالیٰ کے تراجم کی مطابقت کا التزام کیا ہے اس بنا پر یہ ترجمہ ہر طرح قابلِ اعتماد ہے''۔(۳)

''وحی منظوم'' مولانا موصوف کا شاہکار ترجمہ ہے،جس سے مولانا کی بلند پایہ شاعری کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

نمونہ منظوم ترجمہ سورہ کوثر:

(اے پیمبر) ہم نے بے شک تم کو کوثر دے دیا پس پڑھو رب کی نماز اور پھر کروشکر خدا

اور قربانی کرو (نام پر اس کے ادا) جو تمہارا ہے عدو بے نسل وہ رہ جائے گا

۴۔نظم المعانی ترجمہ کلامِ ربانی: مطیع الرحمٰن خادم: نظم المعانی ترجمہ کلامِ ربانی کے نام سے مطیع الرحمٰن خادم نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو مکمل مطبوعہ منظوم تراجم میں دوسرا باقاعدہ ترجمہ ہے۔یہ آگرہ کے رِفاہِ عام پریس سے ۱۹۶۴ء میں طبع ہوا۔اس کا انداز یہ ہے کہ متن قرآن کو درمیان میں رکھا گیا ہے اور صفحے کے تین اطراف میں حاشیے پر ترجمہ ہے جو لفظی ہے اور مثنوی کی ہیئت میں پیش کیا گیا ہے۔

۵۔سحر البیان۔اثر زبیری لکھنوی: اس ترجمہ کو پاکستان کے قیام کے بعد طباعت کے اعتبار سے سب سے پہلا منظوم ترجمہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اس کا زمانہ ۱۹۴۸ء تا ۱۹۶۲ء ہے،تقریباً چودہ سال کی مستقل محنت کے بعد یہ ۱۹۶۲ء میں پایہ تکمیل کو پہنچا۔۱۹۷۴ء کے اواخر سے ۱۹۷۶ء تک مکمل صورت میں پندرہ پندرہ پاروں پر مشتمل دوجلدوں میں الحجاز پبلشرز کراچی سے شائع ہوا۔مہتمم

دارالعلوم دیوبند مولانا محمد طیب کے مشورہ پر اس منظوم ترجمہ قرآن کا نام ''سحر البیان'' رکھا گیا۔ جبکہ مولانا مفتی محمد شفیع کی رائے پر ضرورت شعری کی وجہ سے جو زائد الفاظ ہیں ان کو واوین میں لکھا گیا۔ فاضل مترجم نے زیادہ تر لفظی ترجمہ کیا ہے لیکن بعض جگہ بامحاورہ ترجمہ کا اہتمام بھی کیا ہے اور حد درجہ احتیاط کی کوشش کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے مسلسل اس کی اصلاح بھی کرواتے رہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبدالماجد دریابادی، قاری محمد طیب، مولانا مودودی، مفتی شفیع، مولانا اعزاز علی دیوبندی، مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہ نے اس ترجمہ کو سراہا ہے بلکہ بعض کی اس پر تقاریظ بھی ہیں۔

نمونہ ترجمہ سورہ الناس:

یہ کہیے مانگتا ہوں میں اماں اس 'ذاتِ یزداں' کی ۔۔۔ جو رب ہے مَلِک ہے جو کہ ہے معبود انساں کی

بدی سکھلا کے پیچھے ہٹنے والے کی شرارت سے ۔۔۔ کِیا کرتا ہے پیدا وسوسے جو دل میں انساں کے

وہ شیطاں خواہ 'قومِ جن' سے ہوں یا نوعِ انساں سے

۶۔ قرآن مجید مع عام فہم ترجمہ۔ مولانا عبدالباری: یہ مولانا عبدالباری کا ترجمہ ہے۔ اس میں شاہ ولی اللہ محدث کے فارسی ترجمہ اور شاہ رفیع الدین کے اردو ترجمہ سے بھی مدد لی گئی ہے۔ یہ ۱۹۵۲ء/ ۱۳۷۶ھ میں دفتر اشاعت علوم وفنون حیدرآباد دکن سے شائع ہوا ہے۔ ۱۸۳۲ صفحات پر مشتمل اس کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی، کراچی میں موجود ہے۔

۷۔ مثنوی آبِ رواں۔ شمیم رجز: شمیم رجز نے آبِ رواں کے نام سے قرآن مجید کے منظوم ترجمہ کا آغاز ۱۹۵۲ء میں کیا۔ ۱۹۵۳ء تک پہلے پارے کی تکمیل کی، ۱۹۶۰ء میں اسے ''آبِ رواں'' کے نام سے شائع کروایا۔ ۱۹۶۴ء میں رائٹرز اکیڈمی لاہور سے دوسرا پارہ اور ۱۹۶۸ء میں تیسرے پارے کا ترجمہ شائع کروایا۔ چودہ برس کی مسلسل محنت سے انہوں نے مکمل منظوم ترجمہ کیا۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں اظہار القرآن، لاہور نے اسے شائع کیا۔ رجز صاحب کو اس بات کا خوب احساس تھا کہ منظوم ترجمہ میں معمولی سی لغزش بھی جزا کے بجائے سزا کا باعث بن سکتی ہے اس لیے انہوں نے منظوم ترجمہ کی جگہ 'منظوم مطالب ومفاہیم' لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''اشعار میں قرآن کے مطالب ومفاہیم نظم کیے ہیں، البتہ کوشش یہ رہتی ہے کہ آیات کا ترجمہ نظم کروں'' چونکہ عام لوگوں کے لیے یہ ترجمہ لکھا اس لیے شاعری کی صنف 'مثنوی' کا انتخاب کیا

اوراس کا نام مثنوی آب رواں رکھا۔مثنوی آبِ رواں کی طباعت تین رنگوں میں کی گئی ہے۔گہرے سبز رنگ کا حاشیہ صفحے کو مزین کرتا ہے اور ہلکے سبز رنگ کے کالم میں قرآنی آیت اوراس کے مقابل سفید کالم میں متعلقہ آیت کی منظوم ترجمانی کی گئی ہے''،آخر میں فہرست ہے۔۶۹۲ صفحات پر مشتمل اس منظوم ترجمہ میں مولانا مودودی،سید ابوالحسنات،حافظ نذر احمد،ڈاکٹر فرمان فتح پوری،مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہ نے اس ترجمہ پر دل نشیں تبصرے لکھ کر اسے سراہا ہے۔

آب رواں سلیس وشیریں انداز میں ہے،آیات کو بہترین انداز میں شعری جامہ پہنایا گیا ہے۔سورہ اخلاص کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے:

کہو تم خدا ایک ہے بالیقیں کسی کا وہ محتاج ہرگز نہیں
نہ اس نے کسی کو تولد کیا نہ وہ خود کسی شے سے پیدا ہوا
دو عالم پہ رکھتا ہے وہ برتری کسی کو نہیں جرأت ہمسری

۸۔منظوم اردو ترجمہ: سید محمد حسن: سید محمد حسن کا قرآن مجید کا منظوم ترجمہ صنف مثنوی میں ہے۔یہ ترجمہ ۱۹۶۸ء میں لکھنؤ کے مطبع نظامی سے چھپ کر منظر عام پر آیا۔اس ترجمہ کو فنی اور مفہومِ قرآن کے اعتبار سے خامیوں سے پُر ترجمہ کہا گیا ہے۔(۴)

۹۔فرقانِ جاوید۔عبدالعزیز خالد: عبدالعزیز خالد نے قرآنِ پاک کا منظوم ترجمہ ''فرقانِ جاوید'' کے نام سے کیا،جملہ ۱۰۲۷ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ آزاد نظم کی ہیئت میں کیا گیا ہے۔اگست ۱۹۸۸ء میں پہلی مرتبہ یہ ترجمہ مقبول اکیڈمی لاہور سے چھپا اور ۱۹۸۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا، فرقانِ جاوید میں ہر صفحے کے دو کالم بنائے گئے ہیں۔ایک کالم میں قرآنی آیات اور دوسرے میں منظوم ترجمہ ہے۔اس ترجمہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ہر سورہ کو نئے صفحے سے شروع کیا گیا ہے۔

عبدالعزیز خالد نے آسان سے آسان لفظ برتنے کی کوشش کی ہے۔نمونہ ترجمہ ذیل میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ

کہا اُس نے پروردگار! کِیا میں نے تحقیق ظلم
اپنی جاں پر سو تُو بخش مجھ کو

سو اللہ نے اس کو بخشا

وہ تحقیق بخشندہ مہرباں ہے

۱۰۔ وجدانِ سلیم ۔ میرزا خادم ہوشیار پوری: مرزا ہوشیار پوری نے ۵۲-۱۹۵۱ء میں صرف سورہ فاتحہ کا ترجمہ کیا تھا۔ اساتذہ پنجاب کے ترجمان "بانگ درا" لائل پور میں چھپا تو اتنی پذیرائی ملی کہ پنجاب کے اکثر و بیشتر اداروں میں بطور دعا پڑھا جانے لگا۔ اس کے بعد سورہ بقرہ کی ابتدائی چند آیات کا ترجمہ کیا۔ تیس بتیس سال بعد ۱۹۸۴ء میں انہوں نے دوبارہ اس کا آغاز کیا اور ۱۴۱۲ھ کو قرآن مجید کی یہ منظوم ترجمانی مکمل ہوئی اور ۱۴۱۳-۱۴۱۲ھ میں تین جلدوں میں دارالاشاعت ادارہ تنظیم مساجد، گوجرانوالہ سے اس کی اشاعت عمل میں آئی۔ ہر جلد دس پاروں پر مشتمل ہے جس میں جملہ ۱۲۸۷ صفحات ہیں۔ حافظ نذر کے "آسان ترجمہ قرآن کریم" کو بھی اس میں ملحوظ رکھا گیا ہے۔ متن کے مقابل بائیں صفحے پر منظوم ترجمانی ہے۔

سورہ کافرون کا ترجمہ بطور نمونہ دیا جارہا ہے:

کہو اے کافروسن لو! عبادت جن کی کرتے ہو وہ جن کے سامنے جھکتے ہو، جبینِ عجز دھرتے ہو

تمہارے ایسے معبودوں کی پوجا میں نہیں کرتا یہ ہیں معبود باطل، ان کی پروا، میں نہیں کرتا

نہ تم معبود کی میرے، عبادت کرنے والے ہو محبت کا نہ دم اس کی، کبھی تم بھرنے والے ہو

عبادت جن کی کرتے ہو، عبادت کر نہیں سکتا ربوبیت کا میں ان کی کبھی دم بھر نہیں سکتا

جو ہے معبود میرا، تم عبادت کر نہیں سکتے کبھی چوکھٹ پر اس کی، تم سر اپنا دھر نہیں سکتے

تمہاری راہ سے بے شک جدا ہے راستہ میرا تمہارے سینکڑوں، رب دو عالم ہے خدا میرا

۱۱۔ لوحِ محفوظ ۔ سجاد احمد ساجد مرادآبادی: سجاد احمد ساجد مرادآبادی کے قرآن مجید کے ترجمہ کو اکیسویں صدی کے پہلے منظوم ترجمہ کا شرف حاصل ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰۰۳ء میں الخلیل پاکستان ایجوکیشن سوسائٹی، کراچی سے اشاعت پذیر ہوا ہے۔

۱۲۔ مفہوم القرآن ۔ عطاء قاضی: عطا قاضی نے سب سے پہلے قرآنی دعاؤں کا ترجمہ، پھر توحیدی آیات کا منظوم ترجمہ، سورہ بقرہ، تیسواں پارہ، گیارہواں پارہ، سورۂ عمران، سورۂ نساء اور سورۂ مائدہ کا منظوم ترجمہ کیا جو الگ الگ طبع ہوئے۔ دو سال اور چند ماہ کے قلیل عرصہ میں مکمل قرآن مجید کی منظوم

ترجمانی ''مفہوم القرآن'' کے نام سے کی جس کی پہلی اشاعت ۲۰۰۴ء میں عمل میں آئی۔ مفہوم القرآن تین جلدوں پر مشتمل ہے، جلد اول سورہ فاتحہ سے سورہ توبہ تک، جلد دوم سورہ یونس سے سورہ فاطر اور جلد سوم سورہ یٰسین سے الناس تک ہے۔ انہوں نے قرآن مجید کا اردو نثری ترجمہ بھی کیا ہے۔ مسدس، قطعہ اور رباعی کی شکل میں سلیس منظوم ترجمہ کیا ہے۔

اس منظوم ترجمہ کو علما و دانشوروں نے کافی سراہا اور تقاریظ و تبصروں کے ذریعہ اس کا اظہار کیا ہے۔ جن میں بالخصوص مولانا ابوعمار زاہد الراشدی، ڈاکٹر انور سدید، ضیاء الہاشمی پسروی، ڈاکٹر ممتاز احمد سالک، پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ عبدالقادر، ڈاکٹر عادل صدیق وغیرہ شامل ہیں۔

نمونہ کلام:

سو وہ اللہ کے سوا پاتا نہیں پاس کوئی　　　سو خدا دیتا ہے اس شخص کو پورا پورا
جو بھی کچھ اس کے تھا اعمال میں تحریر ہوا　　　وہ حسابات کو تیزی سے ہے کرنے والا

۱۳۔ منظوم القرآن۔ انجم عرفانی: انجم عرفانی نے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ اپنے والد کی اس شدید خواہش پر کیا کہ وہ قرآن مجید کی کوئی خدمت سرانجام دیں۔ چنانچہ اس خواہش کی تکمیل میں نومبر ۱۹۹۹ء میں تیسویں پارے کا قرآن مجید کا منظوم ترجمہ آزاد نظم میں کیا جسے کافی سراہا گیا۔ دوست واحباب کے اصرار پر فاضل مترجم نے دوسال آٹھ ماہ کی سخت محنت کے بعد جولائی ۲۰۰۲ء میں قرآن مجید کا مکمل منظوم لفظی ترجمہ پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ دورانِ ترجمہ جن تراجم سے استفادہ کیا ان میں مولانا مودودی، مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا احمد رضا خان کے تراجم شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر محمد میاں صدیقی کی مرتب کردہ لغت' قرآن مجید کی عربی اردو لغت' سے بھی استفادہ کیا۔ طریقۂ تالیف یہ تھا کہ سب سے پہلے قرآن مجید کے مشکل الفاظ کو ایک ڈائری میں لکھ لیتے، پھر لغت کی مدد سے آیاتِ قرآنی کو شعری جامہ پہناتے۔

فاضل مترجم نے خود ہی اس کی طباعت کا اہتمام کیا۔ قرآنی متن کے بغیر مکمل ترجمہ قرآن پانچ جلدوں میں کتابت کی بجائے کمپیوٹر کمپوزنگ کے ساتھ شائع کیا۔ پارہ الٓمّٓ تا تلک الرسل پر مشتمل جلد اول ۲۰۰۴ء میں بلرام پور سے، جلد دوم پارہ لن تنالوتا ولوانّنا مارچ ۲۰۰۵ء میں، جلد سوم پارہ قال الملاء تا سبحان الذی جولائی ۲۰۰۵ء، جلد چہارم پارہ ۱۶ تا ۲۵ فروری ۲۰۰۶ء میں اور جلد پنجم پارہ ۲۶

تا پارہ ۳۰/۱ اکتوبر ۲۰۰۶ء میں لکھنؤ سے طبع ہوئی۔

نمونہ کلام سورہ قدر:

۱۔حق یہ ہے کہ نازل کیا قرآن شب قدر میں ہم نے

۲۔کیا جانتے ہیں آپ شب قدر کی وقعت

۳۔اس قدر کی اک شب کی عبادت، ہزار مہینوں کی عبادت سے ہے بڑھ کر۔

۴۔اس رات اترتے ہیں زمیں پر، جبرئیلؑ فرشتوں کے جلو میں، اجازت سے وہ رب کے، اور ساتھ لیے آتے ہیں احکام بھی رب کے، یہ شب تو سراپا ہے خود ہی رحمت و برکت۔

۵۔اور صبح تلک رہتی ہے اس کی یہی حالت۔

۱۴۔مفاہیم القرآن-ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی قلعہ داری: ڈاکٹر احمد حسین احمد قریشی نے قرآن مجید کے مطالب و مفاہیم کو نظم میں ڈھالنے کا کام ۱۹۵۴ء شروع کیا، صرف چار یا پانچ پاروں کے ترجمے کے بعد ایک طویل عرصہ تک یہ سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد دوبارہ ۱۹۸۵ء میں اس کام کو شروع کیا اور صرف چار پانچ ماہ کی محنت شاقہ کے بعد جون ۱۹۸۵ء میں مکمل ترجمہ کو تکمیل تک پہنچایا۔ مصنف ہی کے زیر اہتمام ۱۹۹۶ء میں ادارہ اشاعۃ القرشیہ قلعہ دار ضلع گجرات سے طبع ہوا۔ یہ منظوم مفاہیم و مطالب دو جلدوں میں ہیں ہر جلد پندرہ پاروں پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ متعدد مقامات پر شعری مفہوم پہلے درج ہو گیا اور قرآنی متن اس کے اگلے صفحے پر۔

نمونہ کلام منظوم ترجمہ سورہ الضحیٰ:

قسم ہے روز روشن کی سنائی — قسم شب کی سکوں بن کر جو آئی
تجھے اللہ نے ہرگز ہے نہ چھوڑا — نہ ہو ناراض منہ تجھ سے ہے موڑا
تمہارے واسطے ہاں بعد کا دور — یقیناً پہلے سے بہتر ہے ہر طور
تو خوش ہو جائے گا جلدی جب اللہ تجھے — ہر طرح کی نعمت وہ دے گا
یتیم اس نے تجھے پایا یہ جانا — مہیا کر دیا تجھ کو ٹھکانا
تجھے جب شوق میں اللہ نے پایا — تجھے اس نے عیاں رستہ دکھایا
تجھے اللہ نے تھا نادار پایا — تجھے اس نے غنی ہاں کر دیا تھا

لہٰذا تم یتیموں کو نہ جھڑکو نہ سائل سے کبھی سختی سے بولو
خدا کی نعمتوں کا ذکر ہر دم کرو ہر وقت میں ہر طور میں تم

۱۵۔منظوم اردو ترجمہ قرآن مجید۔سلیم اخترفارانی: سلیم اخترفارانی (م:۲۰۰۷ء) کا منظوم ترجمہ ''منظوم اردو ترجمہ قرآن مجید'' کے نام سے منسوب ہے۔ یہ ترجمہ آزاد نظم کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔

۱۶۔فرقانِ عظیم۔پروفیسر حسین سحر: پروفیسر حسین سحر کا یہ منظوم ترجمہ قرآن مجید پاکستان کے شہر ملتان سے شائع ہوا ہے۔اس ترجمہ کی اب تک دو اشاعتیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔اس کے علاوہ ''فرقانِ عظیم'' کے صوتی اور ویب ایڈیشن بھی موجود ہیں۔

۱۷۔نظم القرآن۔محمد امین میاں: محمد امین میاں نے ''نظم القرآن'' کے نام سے قرآن مجید کا آزاد نظم میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا ہے۔ترجمہ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر صفحہ پر دو کالم بنائے گئے ہیں، ایک کالم میں قرآنی متن اور اس کے مقابل کالم میں منظوم ترجمہ، آیات اور ترجمہ ہر دو جانب میں نمبر لگائے گئے ہیں۔محمد سعید شیخ نے اپنے مضمون 'برصغیر میں سب سے پہلا مکمل منظوم ترجمہ قرآن تعارف وتجزیہ میں اس ترجمہ پر یوں تبصرہ کیا ہے:

> ''......محمد امین میاں کا ترجمہ بہ عنوان نظم القرآن شائع ہوا، جس کی بابت مترجم کا دعویٰ تو منظوم ترجمہ قرآن کا ہے، مگر پورے ترجمے میں مصرع نما کسی بھی دو سطروں پر شعر کا اطلاق کرنا کسی بھی اعتبار سے درست نہیں ہے۔ بہ ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مترجم فن شاعری سے زیادہ واقفیت نہیں رکھتے''۔(۵)

نمونہ ترجمہ سورہ نصر:

اللہ کے نام سے جو ہے رحیم ومہرباں سراسر جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے ادھر
اور آپ دیکھیں اللہ کے دین میں آتے بشر جوق در جوق ، لشکروں کے لشکر
تو حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کر اور اس سے بخشش کی التجا کر
تحقیق وہ کرنے والا ہے درگزر

۱۸۔قرآنِ منظوم۔پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد: پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد نے ۲۰۰۷ء میں ''قرآنِ منظوم'' کے نام سے پانچ جلدوں پر مشتمل قرآن مجید کا منظوم ترجمہ کیا جو کوالا لمپور سے شائع ہوا ہے،

اس ترجمے میں پروفیسر محمد سمیع اللہ اسد نے ترجمے کے ساتھ فرہنگ بھی رکھی ہے تا کہ مفاہیمِ قرآن کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ فاضل مترجم نے صنف مثنوی میں یہ ترجمہ کیا ہے۔

۱۹۔ منظوم مفہومِ قرآن مجید۔ چودھری اصغر علی کوثر: چودھری اصغر علی کوثر وڑائچ کا ''منظوم مفہومِ قرآن مجید'' ۲۰۱۱ء میں پاکستان لٹریچر اکیڈمی سے طبع ہوا ہے۔ یہ لفظی ترجمہ ہے اور مثنوی صنف میں ہے، جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو لاہور کے سربراہ ڈاکٹر محمد سرفراز نعیمی، جامعہ اشرفیہ فیروز پور روڈ لاہور کے مہتمم مولانا عبید اللہ اور نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ مولانا عبدالرحمان اشرفی، ڈاکٹر مفتی غلام سرور قادری سابق وزیر برائے اوقاف و مذہبی امور پنجاب و سربراہ جامعہ رضویہ ماڈل ٹاون لاہور، دینی اسکالر ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اور پروفیسر امان اللہ خان آسی ضیائی نے اس ترجمہ پر تقاریظ لکھ کر سراہا ہے۔

۲۰۔ منظوم مضامین القرآن المجید۔ بریگیڈیئر ڈاکٹر پیر مختار عالم: منظوم مضامین القرآن المجید کے نام سے بریگیڈیئر ڈاکٹر پیر مختار عالم نے قرآن کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے شائع کیا ہے، ''منظوم مضامین القرآن المجید'' کا ہندی ترجمہ بھی ''کاویاسار'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

۲۱۔ تفسیر نبوی منظوم۔ محمد نبی بخش: محمد نبی بخش کا یہ منظوم ترجمہ قرآن کریمی اسٹیم پریس، لاہور نے ۱۹۳۰ء میں شائع کیا ہے۔ ترجمہ منظوم اور حواشی پر مختصر تفسیر بھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کراچی یونیورسٹی لائبریری میں بھی ہے۔

۲۲۔ منظوم اردو ترجمہ۔ ابراہیم بیگ، مرزا چغتائی:

یہ منظوم ترجمہ آگرہ سے ۱۹۴۳ء میں چھپا ہے۔ اس کا مطبع نہیں معلوم ہوسکا۔(۶)

غیر مطبوعہ مکمل منظوم تراجمِ قرآن

۱۔ منظوم قرآنی مفہوم۔ قاری محمد ابراہیم: قاری محمد ابراہیم تقریباً سبھی اصناف میں شعر کہتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ہے۔ قاری صاحب نے اسے ''منظوم قرآنی'' مفہوم سے منسوب کیا ہے جو تقریباً بیس ہزار (۲۰۰۰۰) اشعار پر مشتمل قرآن مجید کی مکمل تفسیر ہے۔ جسے قاری ابراہیم نے دس سال کی کڑی محنت کے بعد ۱۹۷۷ء میں مکمل کیا۔ جو تا حال طبع نہیں ہوسکی۔

۲۔ ترجمانِ قرآن۔ قاضی محمد ایوب نادم: قاضی محمد ایوب کو شاعری کا ذوق اسکول کے زمانے

ہی سے تھا لیکن ان کو قرآن مجید کے مطالب کو منظوم کرنے کا خیال ریٹائرمنٹ کے بعد ۱۹۶۹ء میں آیا۔ چنانچہ فاضل مترجم نے سات سال کی مسلسل محنت کر کے قرآن مجید کا مکمل منظوم ترجمہ کیا۔

۳۔ انوار الایمان ۔ ملک محمد علی: ملک محمد علی نے بھی قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ۱۹۹۷ء میں کیا۔ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان میں بھی ترجمہ کیا۔ فاضل مترجم نے اپنے ترجمہ کا نام انوار الایمان رکھا۔

۴۔ نظم مقدس ۔ آغا شاعر قزلباش دہلوی: ڈاکٹر اعجاز فاروق اکرم کے مطابق آغا شاعر قزلباش نے قرآن مجید کا مکمل منظوم ترجمہ کیا، لیکن اب تک اس کے چھ پارے ہی مطبوعہ شکل میں منظر عام پر آئے ہیں۔ دو دو پاروں کی ایک جلد پر مشتمل اس منظوم ترجمہ کی پہلی جلد اکتوبر ۱۹۷۴ء میں طبع ہوئی، دوسری جلد اپریل ۱۹۷۵ء میں اور تیسری جلد جو ساتویں اور آٹھویں پارے پر مشتمل ہے مئی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی۔ قزلباشان صدر کراچی نے اس منظوم ترجمہ کو طبع کیا ہے۔ ترجمہ کا طریقہ یہ ہے کہ صفحہ کے دو کالم بنائے گئے ہیں، ایک کالم میں ایک آیت، اس کے تحت شاہ عبدالقادر کا ترجمہ اور اس کے مقابل میں اس آیت یا جزوِ آیت کا منظوم ترجمہ ہے۔

جزوی مطبوعہ منظوم تراجم قرآن

۱۔ روحِ قرآن ۔ خواجہ دل محمد: خواجہ دل محمد نے 'روحِ قرآن' کے نام سے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو مکمل کیا۔ یہ منظوم ترجمہ سورہ فاتحہ کی تفسیر و تشریح ہے جو ۲۴۱ صفحات پر مشتمل ہے۔ خواجہ بک ڈپو موہن لال روڈ، لاہور نے اسے پہلی مرتبہ ۱۹۴۷ء میں شائع کیا۔ سورہ فاتحہ کے منظوم ترجمہ کے علاوہ ایک ہزار اشعار میں سورہ فاتحہ کی تفسیر ہے۔

۲۔ آبشار نور ۔ دلاور فگار: "آبشارِ نور" سورہ فاتحہ اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی منظوم تفسیر ہے۔ یہ قرآن حکیم کی منظوم تفسیر کے سلسلہ کی ایک کڑی تھی۔ لیکن افسوس کہ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ اس کے بعد بھی کوئی قسط شائع ہوئی یا نہیں۔ ۱۶ صفحات پر مشتمل یہ تفسیر ہمدرد فاؤنڈیشن پاکستان کے تعاون سے شائع ہوئی۔ اس میں سن اشاعت کا ذکر نہیں ہے۔

۳۔ تنظیم القرآن ۔ چودھری رشید احمد: "تنظیم القرآن" دراصل سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کا منظوم ترجمہ ہے۔ ۸۸ صفحات پر مشتمل یہ ترجمہ مکتبہ تنظیم القرآن مانا نوالہ، ضلع شیخو پورہ سے شائع ہوا۔

۲۲۱۷؍اشعار پر مشتمل اس ترجمہ میں قرآن مجید کا متن نہیں دیا گیا ہے۔اس منظوم ترجمہ کی دو خصوصیات ایسی ہیں جس کی وجہ سے یہ دیگر منظوم تراجم کے مقابلہ میں منفرد حیثیت کا حامل ہے:

۱۔ مترجم نے ایک ہی موضوع کی آیات پر ایک عنوان قائم کر دیا ہے جو موضوع کو واضح کر دیتا ہے۔ جملہ ۱۰۷ عناوین ہیں، ہر عنوان اپنے موضوع کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔تحقیق کرنے والوں کے لیے استفادہ میں بہت آسانی پیدا کر دی ہے۔

۲۔اس میں ہر آیت کے مطالب الگ الگ نظم کیے گئے ہیں اور ساتھ ساتھ آیت کے نمبر بھی درج کر دیے گئے ہیں تاکہ عربی متن نہ ہونے کی وجہ سے قاری کو دقت نہ ہو۔

مترجم نے قرآن کے مفہوم کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب کا لحاظ بھی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ترجمہ عام فہم اور سلیس ہے۔

۴۔تیسواں پارہ۔احمد عقیل روبی: احمد عقیل روبی نے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو ورڈز آف وزڈم مزنگ لاہور سے طبع ہوا ہے۔لیکن اس پر سنِ اشاعت درج نہیں ہے۔اس ترجمہ میں دائیں صفحے پر قرآنی متن اور اس کے تحت مولانا شبیر احمد عثمانی کا نثری ترجمہ ہے اور بائیں صفحے پر قرآنی آیات کا منظوم ترجمہ ہے۔اس کے علاوہ عقیل روبی نے سورہ بقرہ اور سورہ رحمٰن کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے لیکن وہ طبع نہیں ہوسکا۔

۵۔نظام القرآن۔حاجی محمد عمر الدین: حاجی محمد عمر نے نظام القرآن کے نام سے ترجمہ کا آغاز ۱۹۸۷ء میں شروع کیا اور مارچ ۱۹۹۷ء میں اسے مکمل کیا۔تین جلدوں پر مشتمل یہ منظوم ترجمہ مترجم موصوف کے اہتمام ہی میں طبع ہوا ہے۔ترجمہ سلیس اور بامحاورہ ہے۔

۶۔کتاب مستطاب۔حکیم محمد اشرف: حکیم محمد اشرف نے 'کتاب مستطاب' کے نام سے قرآن مجید کی سورہ یوسفؑ کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ دراصل امام غزالیؒ کی تفسیر کا منظوم ترجمہ ہے۔ ۱۸۴۶ء میں بمبئی کے محمدی پریس نے اسے شائع کیا۔

۷۔تفسیر نور۔غلام مرتضٰی جنون: ۱۸۵۱ء میں غلام مرتضٰی جنون الہ آبادی نے قرآن مجید کے سورہ نور کا منظوم ترجمہ کیا جسے بمبئی کے محمدی پریس نے شائع کیا تھا۔

۸۔منظوم ترجمہ پارہ عم۔حافظ ابن عبداللہ: حافظ ابن عبداللہ نے پارہ عم کا منظوم ترجمہ کیا

جو مخطوطہ کی شکل میں کتب خانہ خاص ڈاکٹر مولوی عبدالحق، کراچی میں موجود ہے۔

۹۔ تفسیر پارہ الم۔ سید غضنفر علی: سید غضنفر علی دہلوی نے قرآن مجید کے پہلے پارہ کا منظوم ترجمہ "تفسیر پارہ الم" کے نام سے کیا ہے۔ یہ منظوم ترجمہ ۱۹۳۲ء میں لکھا گیا تھا۔

۱۰۔ قلب القرآن۔ غلام محمد مرتضٰی رہتگی: "قلب القرآن" سورہ یٰس کا منظوم ترجمہ و تفسیر ہے جسے غلام محمد مرتضٰی رہتگی نے تالیف کیا ہے۔ یہ ترجمہ لاہور کے مفید عام پریس سے ۱۹۰۱ء میں طبع ہوا۔

۱۱۔ یوسف ثانی۔ فتح محمد گودھراوی: "یوسف ثانی" کے نام سے فتح محمد گودھراوی نے سورہ یوسف کی منظوم تفسیر ۱۹۶۷ء میں لکھی جو قدیم گوجری اردو زبان میں ہے۔

۱۲۔ تفسیر سورہ والضحیٰ۔ محمد فیروز الدین ڈسکوی: سورہ والضحیٰ کی یہ منظوم تفسیر جسے محمد فیروز الدین ڈسکوی نے تالیف کیا لاہور کے مفید عام پریس سے ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی۔ اس کے علاوہ فیروز الدین ڈسکوی نے پارہ ایک تا چار اور انتیس اور تیس کی تفسیر بھی لکھی جو ۱۹۰۲ء سے ۱۹۲۹ء تک مفید عام پریس لاہور ہی سے طبع ہوئی۔

۱۳۔ نظام حیات۔ کبیر کوثر: کبیر کوثر نے یہ ترجمہ نظام حیات کے نام سے کیا ہے۔ اس میں دراصل شاہ عبدالقادر کے ترجمے کو منظوم کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ ۱۹۶۶ء میں مکتبہ انیس، بھوپال سے شائع ہوا ہے۔

۱۴۔ مفہوم القرآن۔ محمد ادریس کیف بھوپالی: یہ پارہ عم کی منظوم تفسیر ہے جسے کیف بھوپالی نے ۱۹۶۴ء میں لکھا ہے، یہ بنارس کے معراج پبلی کیشن سے شائع ہوئی ہے۔ یہ منظوم تفسیر بھی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔

۱۵۔ تفسیر القرآن۔ محبوب ککے زئی: فاضل مترجم نے "تفسیر القرآن" کے نام سے قرآن مجید کے پارہ اول کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ لاہور کے کیلانی پریس سے ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا ہے۔ اس ترجمہ میں منظوم ترجمہ کے علاوہ آیت کا با محاورہ ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔

۱۶۔ ترجمہ سورہ فاتحہ۔ محمد یعقوب بھٹی: محمد یعقوب بھٹی نے سورہ فاتحہ کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔

۱۷۔ تفسیر سورہ الضحیٰ۔ مولانا معزالدین: مولانا معزالدین نے ۱۹۷۱ء میں سورہ الضحیٰ کا منظوم ترجمہ لکھا تھا۔ اس ترجمہ کا مخطوطہ کتب خانہ شرقیہ، پشاور میں موجود ہے۔

۱۸۔لوحِ محفوظ۔سجاد احمد ساجد مراد آبادی: سجاد احمد مراد آبادی کا یہ منظوم ترجمہ ۱۴/اگست ۲۰۰۶ء میں الخلیل پاکستان ایجوکیشن ویلفیئر سوسائٹی، کراچی سے شائع ہوا ہے۔لوحِ محفوظ میں مترجم نے سورہ فاتحہ، سورہ رحمٰن، سورہ یٰسین، آیت الکرسی، انتیس اور تیسویں پارے کو شعری قالب میں ڈھالا ہے۔

۱۹۔چند سورتوں کی منظوم ترجمانی۔مرزا آصف رسول: مرزا آصف نے مختلف سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو شرق اورینٹل کالج اور اشراق لاہور جیسے مجلوں میں شائع ہوا ہے۔

۲۰۔سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ۔جوش ملیح آبادی: شبیر حسن خان جوش ملیح آبادی اردو زبان کے مایہ ناز شاعر کہلائے جاتے ہیں،انہوں نے سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ کیا جسے ادبی حلقوں میں کافی سراہا گیا، اس منظوم ترجمہ کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے جب جنرل ضیاء الحق نے کسی بات پر ناراض ہوکر جوش ملیح آبادی کا وہ اعزازیہ بند کردیا جو حکومت پاکستان کی طرف سے ادبی خدمات کے اعتراف میں ماہانہ ادا کیا جاتا تھا۔جس پر مولانا کوثر نیازی نے ایک قومی اخبار میں ”کافر شاعر کی مومنانہ شاعری“ کے عنوان سے اپنا کالم لکھا اور اس میں انہوں نے سورہ رحمٰن کے منظوم ترجمے کا حوالہ دیا تھا،یہ حوالہ کام کر گیا اور ان کا ماہانہ مشاہرہ بحال کردیا گیا۔(۷)

نمونہ منظوم ترجمہ سورہ رحمٰن:

خلد میں حوریں تری مشتاق ہیں آنکھیں اٹھا نیچی نظریں جن کا زیور، جن کی آرائش حیا
جِن و انساں میں کسی نے بھی نہیں جن کو چھوا جن کی باتیں عطر میں ڈوبی ہوئی جیسے صبا
کب تک آخر اپنے رب کی نعمتیں جھٹلائے گا

۲۱۔تفسیر چغتائی۔مرزا ابراہیم بیگ چغتائی: مرزا ابراہیم بیگ چغتائی نے ۱۹۳۴ء میں قرآن کا منظوم ترجمہ کیا تھا۔یہ ترجمہ غیر مطبوعہ ہے جو باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوسکا۔ڈاکٹر صالحہ نے انہیں مرزا اعظم بیگ چغتائی کا برادر زادہ بتایا ہے۔یہ ترجمہ غیر مطبوعہ ہے۔

۲۲۔قرآن پاک کا منظوم مفہوم۔ڈاکٹر شہناز مزمل: ڈاکٹر شہناز مزمل نے قرآن پاک کا منظوم مفہوم کے نام سے پارہ عم کا منظوم ترجمہ کیا ہے۔حالیہ دنوں میں قرانِ پاک کے تیسویں پارے کا منظوم ترجمہ اُنھوں نے شائع کروایا ہے اور باقی پارے بھی طباعت کے مراحل میں ہیں۔وہ قرآن مجید کا مکمل ترجمہ لکھ چکی ہیں۔اس لحاظ سے شاید یہ پہلی خاتون ہوں جنہوں نے اردو زبان میں قرآن مجید کا

منظوم ترجمہ تحریر کیا۔ڈاکٹر شہناز نے ۲۰۱۲ء میں اس کام کا آغاز سعودی عرب میں عمرہ کی ادائیگی کے بعد کیا تھا اور ۲۰۱۴ء میں یہ تکمیل کو پہنچا۔جنوری ۲۰۱۷ء میں ادب سرائے پبلیکیشنز، لاہور نے شائع کیا ہے۔محترمہ ڈاکٹر شہناز مزمل صاحبہ ممتاز شاعرہ و نثر نگار ہیں اور ادب سرائے انٹرنیشنل کی سربراہ ہیں۔ اپنے ترجمہ کے سلسلہ میں وہ لکھتی ہیں:

> ''البتہ یہاں میں یہ کہنا چاہوں گی کہ یہ ترجمہ نہیں ہے اور نہ ہی میں اس کی اہل ہوں، بس منظوم مفہوم ہے جسے میری ایک عاجزانہ کاوش کہہ سکتے ہیں''۔(۸)

ڈاکٹر شہناز مزمل کے ادب سرائے انٹرنیشنل کے تحت مشاعروں کے انعقاد کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔اب تک ڈاکٹر شہناز کے بائیس کے قریب شعری مجموعے اور سات نثری کتابیں شائع ہوچکی ہیں، جبکہ غزلوں ونظموں کی کلیات اور کالموں کا مجموعہ زیر طبع ہیں۔ ان پر بہاولپور یونیورسٹی، اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی، منہاج یونیورسٹی اور گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج سمن آباد لاہور کی طالبات نے تحقیقی مقالے بھی لکھے۔

۲۳۔قرآن مجید کی منظوم تفہیم۔عزیز بلگامی: عزیز بلگامی ایک مشہور و معروف اردو شاعر اور ادیب کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔قرآن مجید کی پارہ عم کی مختلف سورتوں جیسے سورۂ فیل، سورہ فلق، سورہ والناس، سورہ قریش وغیرہ کے منظوم تراجم کیے ہیں۔

سطور بالا میں ہم نے اردو میں قرآن کے منظوم تراجم کا ایک سرسری جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔یہ دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا فہرست مکمل ہے۔ہم نے کوشش کی ہے کہ قرآن کے زیادہ سے زیادہ شعری تراجم کا احاطہ کیا جاسکے لیکن اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ ابھی کئی تراجم ہمارے حیطہ علم میں نہیں آسکے ہوں گے۔

شعری ترجمہ کے متعلق یہ بات واضح ہے کہ کسی کلام کو نظم میں اس طرح ڈھالنا کہ وہ شاعر کے خیالات کی صحیح معنوں میں عکاسی کرے ایک انتہائی دشوار گزار کام ہے۔جہاں تک قرآن جیسی الہامی کتاب کے منظوم تراجم کی بات ہے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔جن مترجمین نے کلامِ الٰہی کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ان میں شاید ہی کوئی قرآنیات کا ماہر رہا ہو۔لیکن ان سب نے قرآن کے مختلف تراجم کو سامنے رکھ کر انہیں شعر کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے جس کی وجہ سے

مختلف معتبر علمانے ان تراجم کو نہ صرف پسند کیا ہے بلکہ ان کے مستند ہونے پر بھی گواہی دی ہے۔

قرآن کے منظوم تراجم اردو زبان کے ابتدائی دور ہی سے ہوتے رہے ہیں اور اکیسویں صدی میں بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔جس طرح اردو زبان میں قرآن مجید کے نثری تراجم پر ڈاکٹر احمد خان صاحب نے ایک مبسوط کتابیات تیار کی ہے اسی طرح قرآن مجید کے منظوم تراجم پر بھی ایک کتابیات تیار کرنے کی ضرورت ہے۔تا کہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والوں کے لیے مزید آسانی ہو سکے۔

حوالے

(۱) محمد سعید شیخ، برصغیر میں سب سے پہلا مکمل منظوم ترجمہ،قرآن تعارف وتجزیہ،مشمولہ فکر ونظر،ص ۱۴،جلد ۵۳، شمارہ ۳۔(۲) شمس الدین شائق ایزدی،منظوم اردو ترجمہ،جلد اول،ص: ب۔(۳) اقتباس مولانا حسین احمد مدنی، وحی منظوم: مولانا سیماب اکبرآبادی۔(۴) محمد سعید شیخ،برصغیر میں سب سے پہلا مکمل منظوم ترجمہ قرآن تعارف و تجزیہ،مشمولہ فکر ونظر،ص ۴،جلد ۵۳،شمارہ ۳۔(۵) محمد سعید شیخ،برصغیر میں سب سے پہلا مکمل منظوم ترجمہ قرآن تعارف وتجزیہ،مشمولہ فکر ونظر،اسلام آباد،جلد ۵۳،شمارہ ۳۔ص ۱۳۔(۶) ڈاکٹر احمد خان،قرآن کریم کے اردو تراجم (کتابیات)،ص ۲۴۔(۷) ظفر معین بلے جعفری، جوش ملیح آبادی یادرفتگاں، http//:www.deeban.in (۸) ڈاکٹر شہناز مزمل،قرآن پاک کا منظوم مفہوم،ص ۱۰،ادب سرائے پبلی کیشنز،لاہور جنوری ۲۰۱۷ء۔

سلسلہ ہاشمیہ شطاریہ

تاریخ اور خدمات

ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن علیمی

سلسلہ ہاشمیہ اصل میں سلسلہ شطاریہ کی ایک شاخ ہے۔سلسلہ شطاریہ کو بلاد عرب میں طیفوریہ، بسطامیہ اور عشقیہ سے بھی جانا جاتا ہے۔ ہندوستان میں سلسلہ شطاریہ کی اشاعت حضرت شاہ عبداللہ شطاری سے ہوئی، جنہوں نے ریاضت شاقہ کے بعد علم شغل شطار حاصل کیا،ان کے اخلاق،مجاہدات، نفس کشی اور لگن سے خوش ہوکر ان کے پیر و مرشد شاہ محمد عارف نے ان کو شطار کہہ کر مخاطب فرمایا اور یوں یہ لفظ ''شطار''(۱) ان سے منسوب ہوا۔

بانی سلسلہ شطاریہ حضرت شاہ عبداللہ شطاری: پانچ واسطوں سے ان کا سلسلہ نسب شیخ شہاب الدین سہروردی صاحب عوارف المعارف سے جا ملتا ہے اور سات واسطوں سے یہ روحانی سلسلہ حضرت بایزید بسطامی تک پہونچتا ہے۔ بخارا میں پیدا ہوئے اور عارف باللہ شیخ محمد عارف کی صحبت و تربیت میں سلوک کا تکملہ ہوا۔ نیشاپور اور آذربائیجان میں کچھ وقت گزارا اور پندرہویں صدی عیسوی میں ہندوستان تشریف لائے۔ مانک پور، جون پور میں قیام کیا، شیخ حسام الدین مانک پوری اور مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی سے ملاقات ہوئی، اللہ نے ان کو بڑی عظمت عطا کی تھی، ظاہر و باطن میں عظیم شان و شوکت رکھتے تھے، شیخ محقق نے آپ کے بارے میں یوں تحریر کیا ہے:

> ''از اولاد شیخ بزرگوار شہاب الدین سہروردی است ،سطوت وشوکت ظاہر و باطن داشت، مرشد وقت خود بود و در تلقین اذکار و اشغال کہ مخصوص ومتعارف سلسلۂ شطاریہ است متعین ومنفرد بود......وسلسلۂ ارادت وی بہ پنج واسطہ بشیخ نجم الدین کبریٰ

پتہ: موبائل نمبر: ۹۰۲۶۹۸۱۲۱۶۔

قدس سرہٗ می رسد‘‘(اخبار الاخیار،ص:۱۸۲)

صاحب تذکرہ علما ہند نے ان کے سلسلے میں یوں تحریر کیا ہے:

’’عبداللہ شطاری، ابن شیخ بہلول سندیلوی، دانشمند صوفی اور بہترین تصانیف کے مالک تھے۔ کتاب سراج السالکین، انیس المسافرین، اسرار الدعوات، کنز الاسرار، اشکال الشطاریہ، شرح رسالہ غوثیہ وغیرہ ان کی تصانیف ہیں۔‘‘

(تذکرہ علمائے ہند،ص:۲۳۹)

شاہ عبداللہ شطاری نے بہار اور بنگال کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ بہار کے دورے پر حضرت شیخ محمد علاؤالدین المعروف شیخ علا قاضن (۲) سے ملاقات ہوئی، شیخ علا قاضن کو ان پر اولاً اعتراض ہوا لیکن بعد میں انہوں نے ان کی عظمت کے سامنے سرتسلیم خم کیا اور ان کے غلاموں میں شامل ہو گئے۔ شاہ عبداللہ شطاری سیاحی کرتے اور فیض روحانی لٹاتے ہوئے مانڈوا پہنچے اور ۱۴۸۵ء/ ۸۹۰ھ میں مانڈوا ہی میں انتقال ہوا جہاں آج بھی ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص:۲۳۹)

شاہ شطاری کے بعد ان کے خلفا سے سلسلہ شطاریہ کو بڑا فروغ ملا جن میں شیخ محمد علاؤالدین المعروف اعلا قاضن اور شیخ عبدالحفیظ جونپوری کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ سلسلہ شطاریہ کا فیضان شاہ علاؤالدین المعروف علا قاضن شطاری کے بعد شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست، شاہ ظہور حاجی حضور اور شاہ محمد غوث گوالیری سے ہوتے ہوئے شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی کو پہنچا۔ اِن کے بعد اُن کے لڑکے شاہ عبداللہ حسینی کے واسطے سے شطاری مشائخ کی نعمتیں بانی سلسلہ ہاشمیہ شاہ ہاشم پیر حسینی کو پہنچتی ہیں۔

بانی سلسلہ ہاشمیہ شاہ ہاشم پیر حسینی: خانقاہ ہاشمیہ کے بانی عارف ربانی حضرت سید شاہ ہاشم پیر حسینی (۱۵۷۵ء/ ۱۶۴۶ء) کا شمار دکن کے ممتاز صوفی، داعی و مبلغ کے طور پر ہوتا ہے۔ بیجاپور کو انہوں نے اپنا مسکن بنایا اور ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دورِ حکومت میں خلق خدا کو کفر وضلالت سے نکالا، عوام و خواص کی بروقت دینی رہنمائی کی۔ ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۵ء میں احمد آباد میں ان کی ولادت ہوئی، ولادت کے بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا، والد حضرت شاہ برہان الدین حسینی نے ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ فرمائی۔ حضرت ہاشم پیر کا گھرانہ خالص مذہبی اور علمی تھا۔ خاندان علما و صوفیہ کا مسکن تھا۔ احمد آباد،

گجرات کی سرزمین پر ان کے آباواجداد آباد تھے، جو عوام وخواص کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے، علما وعرفا کے لیے رہنما تھے۔ صاحب تصانیف کثیرہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی حضرت ہاشم پیر کے سگے چچا تھے۔

تعلیم وتربیت: حضرت ہاشم پیر نے ہوش سنبھالا اور ابتدائی تعلیم اپنے خاندان ہی میں حاصل کی، ۱۰۰۲ھ میں ان کے والد برہان الدین حسینی احمد آباد گجرات سے برہان پور، مدھیہ پردیش تشریف لے گئے، اس وقت ان کی عمر ۱۸ رسال کی تھی، اٹھارہ سال کی عمر تک ان کی تعلیم وتربیت احمد آباد ہی میں ہوئی۔ حضرت شیخ وجیہ الدین گجراتی کا جس وقت انتقال ہوا اس وقت ہاشم پیر کی عمر ۱۲ رسال تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ابتدائی تعلیم وتربیت میں عم محترم حضرت وجیہ الدین گجراتی علوی کا بھی کردار رہا ہے۔

حضرت ہاشم پیر اپنی ابتدائی عمر ہی میں والد برہان الدین حسینی کے دست حق پرست پر بیعت ہو گئے، ایک روز عبادت وریاضت میں مشغول تھے کہ والد گرامی نے طلب کیا اور فرمایا: ہاشم کیا حال ہے؟ جواب دیا ''اللہ کا کرم اور حضرت کی توجہ ہے، خوب گزر رہی ہے، میرے لیے دو کف جوار یا گندم کافی ہے، اس میں سے بھی جو کچھ بچ جاتا ہے اس کو اللہ کی راہ میں صرف کر دیتا ہوں'' اس پر والد صاحب نے فرمایا کہ ہاشم اب تم کامل ہو چکے ہو اور پھر اپنی اجازت وخلافت سے نوازا اور ان تمام سلسلوں کی اجازت عطا کی جوان کو اپنے والد بزرگوار حضرت نصر اللہ حسینی اور برادر گرامی حضرت وجیہ الدین علوی حسینی سے حاصل تھی۔

اجازت وخلافت: حضرت ہاشم پیر اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد ۱۰۰۹ھ میں اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ عبداللہ حسینی فرزند اکبر حضرت وجیہ الدین علوی حسینی کے دامن فیض سے وابستہ ہو گئے اور اپنے والد کے حکم کے مطابق روحانی فیوض وبرکات اور مختلف سلاسل کی اجازتیں ان سے بھی حاصل کیں۔

بانی سلسلہ ہاشمیہ کے روحانی سلاسل۔شطاریہ: ۱۔حضرت سید شاہ ہاشم پیر حسینی ۲۔حضرت سید شاہ عبد اللہ حسینی ۳۔حضرت سید شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی ۴۔حضرت سید شاہ محمد غوث گوالیاری ۵۔حضرت شاہ ظہور حاجی حضور ۶۔حضرت شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست ۷۔حضرت شاہ علاؤالدین المعروف علا قاضن شطاری ۸۔حضرت شاہ عبداللہ شطاری ۹۔حضرت شاہ محمد عارف ۱۰۔حضرت شاہ محمد عاشق ۱۱۔حضرت شاہ خدا قلی ماوراء النہر ۱۲۔حضرت شاہ ابوالحسن خرقانی ۱۳۔حضرت شاہ ابوالمظفر مولانا

ترک طوسی ۱۴۔حضرت شاہ ابویزید عشقی ۱۵۔حضرت شاہ محمد مغربی ۱۶۔حضرت شیخ بایزید بسطامی ......الخ۔

سلسلہ چشتیہ: ۱۔حضرت سید شاہ ہاشم پیر حسینی ۲۔حضرت سید شاہ عبداللہ حسینی ۳۔حضرت سید شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی ۴۔حضرت سید شاہ محمد غوث گوالیاری ۵۔حضرت شاہ ظہور حاجی حضور ۶۔حضرت شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست ۷۔حضرت شاہ محمد عیسیٰ جون پوری ۸۔حضرت شیخ فتح اللہ اودھی ۹۔حضرت شیخ صدرالدین ۱۰۔حضرت خواجہ نصیرالدین چراغ دہلوی ۱۱۔حضرت سلطان المشائخ خواجہ نظام الدین محبوب الٰہی ......الخ۔

قادریہ: ۱۔حضرت سید شاہ ہاشم پیر حسینی ۲۔حضرت سید شاہ عبداللہ حسینی ۳۔حضرت سید شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی ۴۔حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری ۶۔حضرت شاہ ظہور حاجی حضور ۷۔حضرت شاہ ہدایت اللہ سرمست ۸۔حضرت شاہ علاؤ الدین علا قاضن شطاری ۹۔حضرت شاہ عبدالوہاب قادری ۱۰۔حضرت شاہ عبد الرؤف قادری ۱۱۔حضرت شاہ عبد الغفار صدیقی ۱۲۔حضرت شاہ محمد قادری ۱۳۔حضرت شاہ محمد علی حسینی ۱۴۔حضرت شاہ جعفر احمد حسینی ۱۵۔حضرت شاہ ابراہیم حسینی ۱۶۔حضرت شاہ عبداللہ حسینی ۱۷۔حضرت شیخ عبدالرزاق قادری ۱۸۔حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ......الخ

بانی سلسلہ ہاشمیہ کے آبائی مشائخ: ہاشم پیر کے جد اعلیٰ حضرت بہاؤالدین حسینی بن کبیرالدین حسینی مدینہ شریف کی حاضری میں نبی کریمؐ سے بشارت پاکر ملک عرب سے ہندوستان تشریف لائے اور گجرات کے پاتری نام کے گاؤں میں سکونت پذیر ہوئے، اس سے پہلے ان کے آباواجداد یمن کے حضرموت مقام میں رہائش پذیر تھے۔ حضرت بہاؤالدین حسینی کا کچھ دن قیام مکہ شریف میں بھی رہا جس کی وجہ سے ان کو مکی بھی کہا جاتا ہے۔ روضۂ نبیؐ سے جب بشارت ہوئی تو انھوں نے اپنے اہل خانہ اور مریدین کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ ہندوستان کا سفر کیا۔ علوم ظاہر و باطن سے آراستہ اور اخلاق کریمانہ کے حامل تھے۔ پاتری ہی میں واصل بحق ہوئے اور وہیں مزار مبارک ہے۔

انتقال کے بعد فرزند سید معین الدین حسینی نے مسند درس وارشاد کو رونق بخشی اور خلق کی خدمت اور خالق کی معرفت کا پتہ بتانے میں اپنی زندگی گزار دی۔ سید معین الدین حسینی کا انتقال بھی پاتری ہی میں ہوا۔ ان کے بعد صاحبزادے سید عطاؤالدین حسینی نے دعوت وارشاد کے سلسلے کو مزید فروغ دیا، وہ عالم وعامل ہونے کے ساتھ پرکشش شخصیت کے مالک تھے، ان کے علم وفضل اور تقوی وطہارت کو

دیکھ کر اس وقت کے بادشاہ نے ان کو پاتری کا قاضی بنایا۔

اس حسینی خاندان کے ہند میں وہ پہلے شخص تھے جن کو قضاۃ کے اس منصب پر مامور ہونا پڑا۔ انتقال کے بعد فرزند حضرت عمادالدین حسینی نے دعوت وارشاد کے سلسلے کو مزید آگے بڑھایا۔ عمادالدین حسینی حضرت ہاشم پیر بانیٔ خانقاہ ہاشمیہ کے پردادا ہوتے ہیں۔

حضرت قاضی سید عمادالدین حسینی: قاضی عمادالدین حسینی کا شمار اپنے زمانے کے ممتاز علما میں ہوتا ہے۔ وہ سید حسین عرف شاہ قاضن چشتی (۳) کی صحبت میں رہے اور چشتیہ طریق کی خلافت و نعمت حاصل کی، ان کے تین صاحبزادے تھے: ۱۔ سید شمس الدین ۲۔ سید فتح اللہ حسینی (جوانی ہی میں شہید کردیے گئے) ۳۔ نصر اللہ حسینی۔ قاضی عمادالدین کا انتقال ۱۰ ذی قعدہ ۹۱۶ھ/ ۱۵۱۰ء میں ہوا۔ مزار پرانوار پاتری میں ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۱۶۸)

حضرت نصر اللہ حسینی: حضرت نصر اللہ حسینی بن سید عمادالدین حسینی کا شمار بلندترین صاحبان شریعت و طریقت نفوس قدسیہ میں ہوتا ہے۔ ان کو حضرت شاہ قاضن چشتی سے چشتیہ سلسلے کی اور اپنے والد ماجد قاضی عمادالدین حسینی سے مغربیہ سلسلے کی اجازت وخلافت حاصل تھی۔ شاہ نصر اللہ حسینی کے پانچ فرزند تھے: ۱۔ سید احمد المعروف شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی ۲۔ سید نجم الدین حسینی ۳۔ سید بہاؤالدین حسینی ۴۔ سید ظہیرالدین حسینی ۵۔ سید برہان الدین حسینی۔

حضرت نصر اللہ حسینی کی وفات ۲۰ محرم الحرام ۹۵۸ھ/ ۱۵۵۱ء میں ہوئی۔ لہ جنات الفردوس نزلا سے تاریخ وصال برآمد ہوتی ہے۔ مزار نیلی گنبد احمد آباد میں ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۱۷۲)

حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی: حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی کو آج بھی دنیا شیخ الشیوخ امام شریعت وطریقت کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ان کی ذات اور دعوتی خدمات کے ذکر کے بغیر ہندوستان کے صوفیہ کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ/ ۱۵۰۴ء میں محمد آباد عرف چانپانیر میں پیدا ہوئے حضرت وجیہ الدین کے والد شاہ نصر اللہ حسینی سلطان مظفر شاہ کی درخواست پر چانپانیر سے منتقل ہوکر احمد آباد تشریف لے گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۸ سال تھی۔

شاہ وجیہ الدین کا پیدائشی نام سید احمد ہے لقب وجیہ الدین اور آسمانی خطاب حیدر علی ثانی ہے۔

وجیہ الدین لقب علوم شرعیہ میں کامل رسوخ کی وجہ سے ہوا، دین حنیف پر مضبوط تمسک اور علوم اسلامیہ میں زبردست پختگی حاصل تھی جس کے ذریعے ان کو دین میں سچی وجاہت حاصل ہوئی۔ مذہباً حنفی اور مشرباً شطاری تھے لیکن دیگر مذاہب ومشارب سے خوب حظ حاصل تھا۔ (حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ: ایک مطالعہ، ص: ۵۳-۵۴ ملخصاً و آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۱۷۳)

صاحب تذکرہ علمائے ہند نے تحریر کیا ہے:

> ''شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی، ماہ محرم ۹۱۱ھ/ ۱۵۰۵ء میں جاپانیر (چمپانیر) مضاف گجرات میں پیدا ہوئے۔(۴) ظاہری علوم ملا عماد طاری کی خدمت میں حاصل کیے اور شیخ قاضن کے مرید ہوئے۔ ظاہری وباطنی خوبیوں میں کمال حاصل کی، خدا تعالیٰ نے اسم شافی کا ان کو مظہر بنایا تھا۔
>
> ہر جمعہ کو ان کے آستانے پر مریضوں کی ایک بہت بڑی جماعت پہنچتی تھی اور ان سے دعا کی درخواست کرتی تھی اور اس کا اثر جلد ہوتا تھا۔ غرض مخلوق خدا کو ہمیشہ ان کی ذات مقدس سے فیض پہنچتا۔ زمانہ کے اکابر واخیار ان کے مکان پر پہنچتے تھے اس کے باوجود ہمیشہ تدریس وتصنیف میں مشغول رہتے تھے۔ وضع اور لباس میں کسی شخص سے ممیز نہیں رہتے تھے، موٹے کپڑے پہنتے تھے۔ جو کچھ فتوحات سے ملتا تھا وہ سخاوت وایثار میں خرچ کردیتے تھے۔'' (تذکرہ علمائے ہند، ص: ۴۵۶)

حضرت غوث گوالیاری سے ملاقات: شاہ وجیہ الدین حسینی نے ۵ رسال کی عمر میں قرآن مکمل کیا، ۷ سال میں حافظ ہوئے، ۲۴ سال کی عمر تک علوم ظاہری وباطنی حاصل کرتے رہے۔ والد سے چشتیہ اور مغربیہ سلسلہ کی اجازت پائی اور ماموں شاہ ابوالقاسم اور شیخ نجم الدین صدیقی سے سہروردیہ سلسلے کے اذکار واشغال سیکھے، سلسلہ شطاریہ اور قادریہ کی نعمت حضرت محمد غوث گوالیاری سے پائی۔

بیان کیا جاتا ہے کہ سید کبیر الدین نامی ایک مجذوب بزرگ نے ان کو بتایا تھا کہ علم باطن کے حصول میں زیادہ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں، چند ہی دنوں میں محمد غوث گوالیاری احمد آباد تشریف لائے، یہ اپنے ماموں یحییٰ کے ساتھ حضرت محمد غوث کی خدمت میں حاضر ہوئے، دیکھتے ہی ان کے گرویدہ ہوگئے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اگر غوث بے لوث کی پابوسی کا شرف حاصل نہ ہوتا

تو میرے اوپر حقیقت کے رموز نہ کھلتے، ان ہی کی وجہ سے مجھے حقیقی ایمان کی بہشت میں چہل قدمی کرنا نصیب ہوا۔ مزید فرماتے ''آن چہ در تمام عمر معرفتہ اللہ حاصل نہ شد در یک شب حاصل شد''۔

اس واقعہ کو صاحب تذکرہ علمائے ہند نے اس طرح تحریر کیا ہے:

> ''جب سلطان محمود گجراتی کے زمانہ میں شیخ محمد غوث گوالیاری مصنف جواہر خمسہ گجرات پہنچے تو شیخ علی متقی نے جو اس علاقہ کے بڑے شیخ اور ممتاز عالم تھے شیخ محمد غوث کے قتل کا فتویٰ لکھا۔(۵) سلطان محمود گجراتی نے اس کا نفاذ شیخ وجیہ الدین کی رائے پر موقوف رکھا۔ شیخ وجیہ الدین نے شیخ محمد غوث سے ملاقات کی تو فوراً ان کے جمال با کمال کے گرویدہ ہو گئے اور استفتاء کو پارہ پارہ کر دیا۔ شیخ محمد غوث نے اس مہلکہ سے نجات پائی، عوام نے ان کی طرف رجوع کیا، اور علاقہ کے حکام ان کے معتقد ہو گئے''۔(تذکرہ علمائے ہند،ص:۴۵۷)

ہاشم پیر کے ملفوظات ''مقصود المراد'' میں ہے کہ شاہ وجیہ الدین کی تربیت حضرت شاہ محمد غوث گوالیاری نے فرمائی اور علم حقائق سکھایا اور باوجودیکہ انہوں نے ۲۲ رسال کی عمر میں ۱۲۰ رعلوم حاصل کیے لیکن خود شاہ صاحب (حضرت وجیہ الدین حسینی) فرماتے ہیں کہ اگر میں شیخ سے ملاقات نہ کرتا تو میں مسلمان نہ ہوتا اور پھر فرمایا کہ جو معرفت الٰہی تمام عمر میں حاصل نہ ہو سکی وہ ایک شب میں حاصل ہو گئی۔(حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ: ایک مطالعہ،ص:۵۷)

اجازت وخلافت: رسالہ ہاشمیہ میں درج ہے کہ وجیہ الدین حسینی فرماتے ہیں مجھ سے حضرت محمد غوث نے نہ ریاضت کروائی اور نہ ہی مجاہدہ مگر اپنی تین انگلیوں سے میرے سینے کو زور سے دبایا، جب ایک انگلی دبائی تو فنافی الشیخ کا درجہ نصیب ہوا، دوسری انگلی دبائی تو فنافی الرسول کا مقام حاصل ہوا، تیسری انگلی دبانے سے فنافی اللہ کا مقام حاصل ہوا۔ شیخ محمد غوث گوالیاری کے توسط ہی سے ایک اور طریق سے چشتیہ سلسلے کی خلافت ان تک پہنچی ہے، جس کا ذکر روحانی سلاسل کے ضمن میں ہو چکا۔

مدرسہ عالیہ علویہ سے مدرسہ درس محمدی تک: حضرت وجیہ الدین گجراتی نے تحصیل علوم سے فارغ ہونے کے بعد درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، مدرسہ عالیہ علویہ کے نام سے عظیم الشان مدرسہ قائم کیا، ایران کے مدرسہ نظامیہ کے طرز پر جہاں درس کا اہتمام تھا۔ بے شمار شاگردوں کی تربیت وتعلیم کی۔

وجیہ الدین حسینی نے عمر کے آخری حصہ میں چاہا کہ درس دینا بند کردیں اور اس کی ذمہ داری کسی اور کے سپرد کردیں تو خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور فرمایا کہ درس کا سلسلہ بند نہ کیا جائے، تم درس دیتے رہو۔ سرکار دو عالمؐ کے اس حکم کے بعد درس کے سلسلے کو منقطع کرنے کا خیال نکال دیا اور مدرسہ کا نام مدرسہ عالیہ علویہ سے بدل کر مدرسہ درسِ محمدی رکھ دیا اور عمر کے آخری سانس تک درس دیتے رہے۔

احمد آباد گجرات میں ۹۳۴ھ میں مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ تقریباً ۶۴ سال درس وتدریس کا سلسلہ جاری رکھا، اس مدت میں ہزاروں طلبہ نے مدرسہ سے فراغت پائی۔ درس وتدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی جاری رکھا، صرف فن حدیث پر بتیس رسالے تحریر فرمائے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے ان کی تصنیف وتالیف کی تعداد (۱۹۷) ایک سو ستانوے بتائی ہے جب کہ بعض حضرات نے اس سے بھی زیادہ شمار کیا ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص:۱۸۸)

تصنیفات وتالیفات: ۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی ۲۔ حاشیہ تلویح ۳۔ حاشیہ کشف الاصول بزدوی ۴۔ حاشیہ علی المواقف ۵۔ حاشیہ الہدایۃ ۶۔ حاشیہ شرح تجرید ۷۔ حاشیہ شرح مقاصد ۸۔ حاشیہ شرح عقائد ۹۔ حاشیہ شرح نخبۃ الفکر ۱۰۔ حاشیہ علی شرح الوقایہ ۱۱۔ حاشیہ العضدیہ ۱۲۔ حاشیہ شرح جامی ۱۳۔ حاشیہ مطول ۱۴۔ حاشیہ مختصر ۱۵۔ حاشیہ شرح چغمینی ۱۶۔ حاشیہ قطبی ۱۷۔ حاشیہ شرح ملا ۱۸۔ حاشیہ ارشاد النحو ۱۹۔ حاشیہ مختصر المعانی ۲۰۔ وافیہ شرح کافیہ، وغیرہ۔

ان کی چند مشہور کتابوں میں حقیقت محمدیہ، رسالۃ جنت العدن اور شرح حکمۃ العین، ہے۔ حقیقت محمدیہ عربی زبان میں لکھی گئی، یہ کتاب اپنے موضوع اور مضامین کے لحاظ سے ایک بلند پایہ اور اہل علم وعرفان کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہے، جس کی عربی شرح علامہ مرزا محمد دائم ہندی نے الافاضات الاحمدیۃ کے نام سے کی ہے۔ مولانا جلال ازہری کی تحقیق کے ساتھ مطبعہ الکیلانی، قاہرہ نے ۲۰۰۷ء میں اس شرح کو شائع کردیا ہے۔

افادۂ عام کے لیے ان کے تلمیذ حضرت مولانا عبدالعزیز خالدی نے فارسی زبان میں اس کا ترجمہ فرمایا۔ حال ہی میں مولانا نصر اللہ رضوی مصباحی نے اہل علم کے استفادہ کے پیش نظر اس فارسی کا اردو ترجمہ کیا ہے جو ۲۰۱۰ء میں المجمع الاسلامی، مبارکپور سے شائع ہوا ہے۔ ملفوظات کے مجموعے بھی

دستیاب ہیں۔

شیخ محقق کی آپ سے ملاقات: شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی حضرت وجیہ الدین حسینی سے ملاقات کی۔ شیخ محقق حج کے سفر پہ تھے کہ احمد آباد میں حضرت وجیہ الدین علوی کی ملاقات کی غرض سے دو روز قیام کیا اور سلسلہ عالیہ قادریہ کے بعض اذکار و اشغال کی اجازت حاصل کیں، جس کا ذکر ''اخبار الاخیار'' میں انہوں نے خود کیا ہے۔

چند ممتاز خلفا: ۱۔ برہان الدین حسینی (والد ماجد حضرت ہاشم پیر حسینی، بانیٔ خانقاہ ہاشمیہ، بیجاپور) ۲۔ سید صبغت اللہ روح اللہ حسینی ۳۔ سید جلال الدین ملتانی ۴۔ علامہ کمال محمد عباسی گجراتی ۵۔ مولانا شیخ یوسف بنگالی ۶۔ حضرت شاہ علی متقی ۷۔ مولانا سید شاہ عبدالغفور کاشمیری ۸۔ مولانا عبدالغنی جونپوری ۹۔ مولانا عبداللہ شطاری ۱۰۔ سید ضیاء الدین ابن محمد غوث گوالیاری ۱۱۔ شاہ عبداللہ محمد بن غوث گوالیاری ۱۲۔ شیخ یٰسین پیرومرشد شاہ شہباز بانی سلسلہ شہبازیہ بھاگل پور (۶) وغیرہ۔

ان حضرات نے سلسلہ شطاریہ کو پورے ملک میں عام کیا۔ جنوبی ہند میں سلسلہ شطاریہ ان کے بھتیجے حضرت ہاشم پیر ابن محمد برہان الدین حسینی راز الٰہ سے خوب عام ہوا۔

ہندوستان میں سلسلہ شطاریہ وہ سلسلہ ہے جس کا فیضان عرب ممالک تک پہنچا۔ شاہ وجیہ الدین حسینی کے خلیفہ شاہ صبغت اللہ روح اللہ حسینی بھڑوچی نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے دور میں چند سال بیجاپور میں قیام کیا، پھر مدینہ منورہ چلے گئے، جہاں ان کے ذریعے سلسلہ شطاریہ کی تعلیمات خوب عام ہوئی، بعض عرب علما آپ سے فیض یاب ہوئے اور فیضان کا یہ سلسلہ مندرجہ ذیل نامور علما تک پہنچا:

شیخ احمد شناوی، شیخ احمد قشاشی، شیخ ابراہیم کردی مدنی، ملا ابراہیم القرآنی، شیخ ابو طاہر کردی مدنی، شاہ عبدالرؤف شطاری وغیرہ ان حضرات سے سلسلہ شطاریہ کا فیضان جزائر شرقی اور عرب کے مختلف خطوں میں خوب عام ہوا، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو بھی سلسلہ شطاریہ کا فیضان انہیں نفوس قدسیہ سے پہونچا ہے۔ وہ سلسلہ یہ ہے: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، خلیفہ شیخ ابو طاہر کردی، خلیفہ شیخ ابراہیم کردی، خلیفہ شیخ احمد قشاشی، خلیفہ شیخ احمد شنوی، خلیفہ حضرت صبغت اللہ بھڑوچی، خلیفہ وجیہ الدین علوی گجراتی............ الخ۔ (حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ ص: ۶۱ تا ۷۰ ملخصاً)

وصال: شیخ وجیہ الدین نے ۲۹ صفر بروز یک شنبہ ۹۹۸ھ/ ۱۵۸۹ء کو رحلت فرمائی۔ احمد آباد گجرات

میں دفن ہوئے ''ولھم جنات الفردوس نزلا'' سے ان کی تاریخ انتقال نکلتی ہے۔(تذکرہ علمائے ہند، ص:۴۵۶۔۴۵۷)

حضرت برہان الدین حسینی: حضرت برہان الدین حسینی نصر اللہ حسینی کے سب سے چھوٹے فرزند اور شاہ وجیہ الدین حسینی کے سب سے چھوٹے بھائی اور شاہ ہاشم پیر بیجاپوری کے والد گرامی ہیں۔ ولادت چانپانیر(۷) میں ہوئی جہاں والد ماجد شاہ نصر اللہ حسینی مسند قضا پر فائز تھے، بعد میں احمد آباد منتقل ہوئے، تعلیم شاہ وجیہ الدین حسینی کے ساتھ ہوئی، حضرت برہان الدین حسینی اوائل عمر ہی سے عبادت وریاضت کے عادی تھے، فقر وتوکل مرغوب تھا، حضرت برہان الدین حسینی کو سلاطین وامرا کی صحبت وقربت سے اجتناب تھا اور تنہائی پسند تھی۔

حضرت وجیہ الدین حسینی نے اپنے وصال سے ایک سال قبل حضرت برہان الدین حسینی کو اپنی خدمت میں طلب کیا اور اخیر تک ساتھ رکھا، جملہ نعمت صوری ومعنوی کی اجازت عطا کی اور فرمایا: آپ میرے چھوٹے بھائی ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کو مردِ صالح اور منصف مزاج بنایا ہے اور اپنی ولایت عطا کی ہے، آپ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ میرے بعد آپ برہان پور منتقل ہوجائیں، بہت سارے مشائخ وہاں آباد ہیں، بے شمار اولیائے اسلام وہاں آرام فرما ہیں، وہاں جاکر خلق خدا کو اپنے نور باطن سے مستفیض کریں۔(حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ، ص:۷۰ تا ۷۳ ملخصاً)

چنانچہ حضرت سید وجیہ الدین حسینی کے وصال کے بعد وصیت پر عمل کرتے ہوئے برہان پور روانہ ہوگئے، اور فاروقی بادشاہ راجہ علی خان فاروقی کے عہد میں ۱۰۰۲ھ مطابق ۱۵۹۴ء میں برہان پور کو اپنا مسکن بنایا، ایک بلند مقام پر فروکش ہوئے جہاں عبادت وریاضت میں مشغول رہتے، خلقِ خدا مستفیض ہوتی، ۷ ذی قعدہ یا ۹ ذی قعدہ ۱۰۰۹ھ مطابق ۱۶۰۱ء کو وصال ہوا۔ انتقال کے وقت عمر تقریباً ۹۳ سال تھی، شہر برہان پور کے قصبہ لال باغ میں بلند ٹیکری پر ان کا مرقد زیارت گاہ عام وخاص ہے۔

شاہ عبداللہ حسینی: حضرت وجیہ الدین حسینی کے بعد ان کے بڑے لڑکے شاہ عبداللہ حسینی مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے۔ حضرت ہاشم پیر بانی خانقاہ ہاشمیہ، بیجاپور اپنے والد برہان الدین برہان پوری کے انتقال کے بعد اپنے چچازاد بھائی حضرت شاہ عبداللہ حسینی ابن وجیہ الدین حسینی کے دامن سے وابستہ ہوئے، انہیں کی تربیت میں سلوک کا تکملہ ہوا اور پھر اجازت وخلافت سے سرفراز کیے گئے،

اس وقت عمر ۲۵ سال تھی۔

شاہ عبداللہ حسینی کم و بیش ۲۴ سال اپنے والد کے درس میں حاضر رہے اور علمی و روحانی فیضان سے سیراب ہوئے، والد کے بعد ۲۰ سال مسند درس و ارشاد کو زینت بخشی۔ ۷ محرم الحرام ۱۰۱۷ھ/۱۶۰۸ء کو وصال ہوا۔ اس وقت عمر ۸۷ سال تھی۔ احمد آباد گجرات میں اپنی آبائی خانقاہ میں والد گرامی کے مزار کے پاس محوِ خواب ہیں۔

حضرت عبداللہ حسینی کے وصال کے بعد ان کے فرزند شاہ اسد اللہ حسینی اس خانقاہ کے صاحب سجادہ ہوئے۔ سجادگی اور بیعت و ارادت اور رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ احمد آباد گجرات میں آج بھی جاری ہے۔

بانی سلسلہ ہاشمیہ کے بعض روحانی مشائخ۔ حضرت شاہ محمد علاؤ الدین المعروف علا قاضن شطاری: انہوں نے اپنے پیر و مرشد شاہ عبداللہ شطاری کے بعد سلسلہ شطاریہ کی خوب تبلیغ کی اور ہند کے مختلف اطراف میں سلسلہ شطاریہ کا فیضان عام کیا۔ ان کے آبا و اجداد بلاد عرب سے آ کر بہار کے منیر میں آباد ہوئے تھے۔ (۸)

حضرت شاہ عبداللہ سے جب ان کی پہلی ملاقات ہوئی تو وہ معترض ہوئے لیکن خواب میں بشارت ہوئی کہ تمہارے دل کی گرہ شاہ عبداللہ شطاری کی صحبت میں ہی کھلے گی، پھر تائب ہوئے اور شاہ عبداللہ شطاری سے ملاقات کی غرض سے مانڈوا حاضر ہو گئے جہاں سخت امتحان سے گزرنا پڑا اور پھر حضرت عبداللہ شطاری کی صحبت میں ان کے سلوک کا تکملہ ہوا۔

۴ ذی الحجہ ۸۸۱ مارچ ۱۴۷۶ء کو مشرب شطار کے مطابق ان کے شیخ نے تلقین ذکر اور اجازت و خلافت سے نواز کر وطن واپس کیا۔ خلق خدا کی ایک بڑی جماعت نے ان سے روحانی سیرابی حاصل کی۔ بہار کو اپنی دعوت و تبلیغ کا مرکز بنایا اور ویشالی گڑھ میں اپنی خانقاہ قائم کی۔ اس دور میں یہ پورا خطہ کفر و شرک میں ڈوبا ہوا تھا اور ظلم و زیادتی عام تھی، ان کی دعوت کا اس علاقے میں یہ اثر ہوا کہ ظلم و زیادتی کا سلسلہ ٹھہر گیا اور لوگ کفر و شرک کی وادی سے نکل کر اسلام کے دامن سے وابستہ ہو گئے۔ شمالی بہار کے ویشالی، مظفر پور، حاجی پور، چھپرہ، سیوان کے اضلاع میں حضرت علا قاضن کا فیضان خصوصیت کے ساتھ عام رہا اور یہاں کے انسانوں کو ان کے ذریعے اپنے مالک و خالق کی معرفت حاصل ہوئی۔

اولاد و اخلاف: حضرت علا قاضن کے تین صاحب زادے تھے: ۱۔حضرت اویس ۲۔حضرت عبدالرحمٰن ۳۔حضرت ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست۔(۹)

حضرت نے دیگر خلفا کے ساتھ اپنی روحانی نعمتوں کا وارث اپنے تینوں صاحب زادوں کو بھی بنایا،خلفا میں حضرت شیخ ظہور حاجی حضور اور فضل اللہ گوسائی (۱۰) کے نام نمایاں ہیں۔

حضرت علا قاضن کے ملفوظات کے دو مجموعے ''معدن الاسرار'' اور ''جواہر الاسرار'' کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے،غالب گمان ہے کہ پٹنہ یا بہار شریف کی کسی لائبریری میں یہ کتابیں موجود ہوں۔ حضرت قاضن شطاری عظیم صوفی اور زبردست مربی وداعی تھے۔ان کا اثر شمالی بہار کے اکثر علاقوں پر رہا، ہزاروں خاندانوں نے ان کے دست حق پرست پر اسلام قبول کیا۔(آیات الٰہی کے نگہبان،ص:۵۲)

وصال: ۶۱ سال کی عمر میں ۱۴۹۶/ ۹۰۳ھ میں ان کا انتقال ہوا۔(۱۱) اورویشالی گڑھ میں راجہ ویشال کے محل کے قریب جنوبی جانب ایک بلند مقام پر مدفون ہوئے،ان کا مزار آج بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔عرس کے موقع پر ایک بڑا میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں بلاتفریق مذہب وملت کافی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں۔(آیات الٰہی کے نگہبان،ص:۲۶)

شیخ ظہور حاجی حضور: شیخ ظہور حاجی حضور شاہ علا قاضن کے خلیفہ تھے۔مرشد کے وصال کے بعد انہوں نے دعوت وتبلیغ کا کام جاری رکھا اور اپنے مرشد زادے حضرت شاہ ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خدمت کی۔(۱۲)

۸۳۵ھ میں حاجی حضور کی پیدائش ہوئی، پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا، شیر خواری کے ایام سے گزر رہے تھے کہ گوالیر کے سفر میں والد شہید ہوگئے۔بڑے ہونے کے بعد مدینہ شریف حاضر ہوئے اور ۴۰ سال تک اسی مقدس در کی جاروب کشی کی،مکہ شریف حاضری کے درمیان ہندوستان واپس ہونے کی بشارت ہوئی، بشارت کے مطابق ہندوستان آکر حضرت شاہ علاؤالدین علا قاضن سے بیعت ہوئے اور انہیں کے ہوکر رہ گئے۔

اپنے پیرزادے حضرت ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی معاونت وخدمت کے ساتھ مزید دو یتیم بچوں کی بھی تعلیم وتربیت کی۔ ۱۔محمد پھول ۲۔محمد غوث۔یہ دونوں حضرت خواجہ فریدالدین عطار کی اولاد سے تھے۔تربیت کا یہ اثر ہوا کہ ان دونوں نے معرفت وحقیقت کے امام بن کر پورے ملک میں اپنے

پیروں کی نعمتوں کا فیضان تقسیم کیا۔ایک کو دنیا محمد فرید الدین عرف محمد پھول کے نام سے اور دوسرے کو محمد غوث گوالیاروی کے نام سے جانتی ہے۔حضرت غوث گوالیاروی کا پورا نام محمد حمید الدین ہے۔ حضرت شاہ ظہور نے ان دونوں سے زبردست ریاضت کرائی اوران کی خوب پختہ تربیت کی۔

حضرت شاہ ظہور کا انتقال ۹۳۰ھ میں ہوا۔لمبی عمر پائی تھی،شمالی بہار کے سارنگ ضلع کے رتن سرائے گاؤں میں مدفون ہیں۔(آیات الٰہی کے نگہبان،ص:۵۹ تا ۶۴ ملخصاً)

حضرت محمد غوث گوالیاروی: سلسلہ شطاریہ کے مشائخ میں مشہور ترین شخصیت حضرت محمد غوث گوالیاری کی ہے جن کا اصل نام محمد حمید الدین ہے۔حضرت محمد غوث گوالیاروی اپنے تعلق سے اورادِ غوثیہ میں خود تحریر کرتے ہیں کہ وہ ۷ رجب المرجب بروز جمعہ ۹۰۷ھ میں پیدا ہوئے۔مزید تحریر کیا ہے کہ اس درویش نے ۷ رسال کی عمر میں راہ طریقت میں قدم رکھا، ۹ رسال کا تھا تو معرفت الٰہی حاصل ہوئی، ۱۵ رسال کی عمر میں رہنما بن گئے، ۲۵ رسال کی عمر میں طالبان طریقت کو اللہ کے رنگ میں رنگ رہے تھے، ۳۳ سال کی عمر میں مرجع خلائق ہو چکے تھے، ۴۰ سال کی عمر میں بادشاہوں سے کچھ اختلاف ہوگیا اور مجبوراً گجرات کا سفر کیا اور احمد آباد میں قیام پذیر ہوئے۔

۱۶ رویں صدی کی ابتدا میں محمد غوث گوالیاروی اوران کے برادرِ بزرگ شیخ محمد پھول کا شمار سلسلہ شطاریہ کے نامور صوفیہ اور شیخ ظہور حاجی حضور کے اولوالعزم خلفا میں ہونے لگا۔شیخ ظہور نے ان دونوں بھائیوں کو نہ صرف سلوک و باطن کی پوری تعلیم دی بلکہ نامور خانوادوں کے باکمال مشائخ کے اطوار واسرار بالخصوص شطاریہ مشرب کی رفتار،دعوت کا فن،افکار کی طرز اوراشغال وتصورات کی سندیں اور مختلف سلاسل کی تعلیم وتلقین سے آراستہ کیا تھا۔

شیخ محمد غوث گوالیاروی کے برادرِ بزرگ شیخ پھول کا اصل نام فرید الدین اور خطاب جہاں گیر تھا۔زبردست صوفی اور عارف باللہ تھے،مغل بادشاہ ہمایوں ان کا معتقد تھا،اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا،ہمایوں کی تعلیم ہی کے پیشِ نظر انہوں نے رسالہ ''بحر الانوار'' تحریر کیا،علمِ نجوم میں بڑے ماہر تھے،علمِ نجوم بھی ہمایوں کے قریب ہونے کا سبب بنا،ہمایوں ان سے بیعت بھی ہوا۔

حضرت محمد غوث اپنے پیرو مرشد سے اجازت وخلافت پا کر تقریباً ۱۳ رسال پہاڑوں، جنگلوں میں مجاہدہ کرتے ہوئے گوالیر میں سکونت پذیر ہوئے اور بادشاہ ہمایوں اور اکبر کے درباریوں کو

اپنے فیوض و برکات سے مستفیض فرمایا۔ جب شیر شاہ سوری دلی پر قابض ہوئے تو گوالیر سے احمد آباد ہجرت فرما گئے، ۱۸ سال احمد آباد میں قیام کیا، وہیں ایک مسجد اور خانقاہ کی تعمیر کرائی، اسی دور میں حضرت وجیہ الدین حسینی ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوئے، جب اکبر تخت نشیں ہوا تو انہوں نے آگرہ اور آگرہ سے گوالیر آکر سکونت اختیار کی۔ ۱۴ رمضان ۹۷۰ھ کو وصال ہوا اور گوالیار میں مدفون ہوئے، اکبری دور کا مشہور زمانہ نورتن اور فن موسیقی کا ماہر تان سین ان ہی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا، جس کا اسلامی نام عبداللہ تھا، وہ ان کے روضہ کے پائیں میں مدفون ہے۔

تصانیف: حضرت نے مختلف کتابیں تصنیف کیں: ۱۔ جواہر خمسہ ۲۔ بحر الحیات (اس کتاب میں باطنی اعمال، تصوری اشغال اور دیگر اعمال کے ساتھ وجود اور تسخیرات پر بھی بحث فرمائی ہے) ۳۔ کلیدِ مخازن ۴۔ کنز الوحدت (یہ آخری تصنیف ہے جس میں انہوں نے توحید کشفی اور ایمان حقیقی پر بحث فرمائی ہے) ۵۔ ضمائر و بصائر (ان دونوں رسالوں میں علم تصوف کے موضوع، مبادی، مسائل اور مقاصد کا ذکر کیا ہے اور معرفت کے حقائق و دقائق بیان کیے ہیں) ۶۔ رسالہ معراجیہ۔

خلاصہ یہ کہ شیخ محمد غوث گوالیاروی سلسلہ شطاریہ کے سرخیل اور حضرت وجیہ الدین علوی گجراتی کے مرشدِ خلافت ہیں، جن کا فیضان پورے ملک میں پہونچا۔ اور حضرت وجیہ الدن گجراتی کے ذریعے یہ فیضان دنیا کے مختلف ممالک تک پہنچ گیا۔

خانوادہ ہاشمیہ کی بعض اہم شخصیات: ۱۔ سلسلہ ہاشمیہ کی قدآور شخصیات میں حضرت عبداللہ حسینی المعروف صوفی شاہ سرمست قلندر کا نام نمایاں ہے، یہ وجیہ الدین حسینی سوم بن برہان الدین حسینی دوم کے تربیت یافتہ خلیفہ تھے۔ ناندورا میں اپنی خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور وہیں مجردانہ اور زاہدانہ زندگی گزاری، انوارِ الٰہی اور تجلیات ربانی سے ہمیشہ بے خود و سرمست رہا کرتے تھے، اپنے معتقدین و مریدین کا بڑا سخت امتحان لیتے اور سخت تربیت فرماتے تھے۔

شاہ عبداللہ حسینی المعروف صوفی سرمست قلندر کے کئی خلفا کے نام ملتے ہیں مثلاً ۱۔ صوفی حسین علی شاہ صاحب (نرمل ضلع عادل آباد) ۲۔ تاج الدین بابا ناگپوری ۳۔ غلام نبی اسرار الحق قادری شطاری، ایڈپلی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ سلوک کی امانت حسین علی شاہ صاحب کو اور جذب کی امانت تاج الدین بابا کے حوالے کی گئی ہے۔ انتقال ۱۳۵ رسال کی عمر میں ہوا۔ ناندورا میں درگاہ

زیارت گاہِ خاص و عام بنی ہوئی ہے۔

زبانی روایتیں یہ بھی ہیں کہ شرڈی کے سائی بابا (م: ۱۹۱۸ء/ ۱۳۳۶ھ) نے بھی شاہ عبداللہ حسینی المعروف صوفی سرمست قلندر کی ذات سے وابستہ ہوکر فیض پایا تھا۔ سائی بابا اصلاً ایک مسلم فقیر منش صوفی بزرگ تھے۔ اکثر جذب کی حالت میں رہتے اور زبان کثرت سے اللہ کی وحدت کا ذکر کرتی تھی۔ زبان پر یہ قول چڑھا ہوا تھا: "سب کا مالک ایک"۔ (حضرت ہاشم پیر اور سلسلۂ شطاریہ، ص: ۱۶۹)

۲۔ سید شاہ مصطفیٰ حسینی (۱۹۵۹ء) کا شمار ماضی قریب کے تاریخ ساز داعی و مبلغ کے طور پر ہوتا ہے، ان کے ذریعے شمالی کرناٹک کے اکثر علاقوں میں سلسلہ ہاشمیہ کا فیضان خوب عام ہوا، کہنہ مشق شاعر، ایک عظیم خطیب اور داعی و صوفی تھے، محدود وسائل کے ساتھ دینی کام کرنے کا ہنر رکھتے تھے۔

ان کی خدمات سے پورا کرناٹک فیضیاب ہوا، بالخصوص شمالی کرناٹک ان سے براہ راست مستفیض ہوا، شمالی کرناٹک کی ادبی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی اور تہذیبی تاریخ ان کے تذکرے کے بغیر نامکمل مانی جائے گی۔ ان کی شخصیت ہاشمی خانوادے کے لیے قابل فخر اور لائق تحسین تھی۔ خانقاہ ہاشمیہ کے شیخ طریقت، حضرت محی الدین عرف تنویر ہاشمی ان کے پوتے ہوتے ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں ان کی ولادت ہوئی اور اپنے والد محترم شاہ عبداللہ حسینی کے وصال کے بعد اپنے برادر اکبر صاحب سجادہ سید شاہ مرتضیٰ حسینی (ولادت: ۱۹۰۰ء) کی دعوت و تبلیغ میں خوب مدد کی۔

شاہ مصطفیٰ حسینی علم و معرفت کے حریص تھے، اس جستجو میں ہمیشہ سرگرداں رہے، دعوت و تبلیغ کو اپنی زندگی کا مقصد جانتے تھے، پیروں سے جو نعمتیں پائی تھیں اس کی اشاعت میں پوری زندگی لگے رہے۔ ۲۸ شوال ۷ رمئی ۱۹۵۹ء میں ان کا وصال ہوا، اس وقت ان کی عمر ۵۸ سال کی تھی۔

حضرت ہاشم پیر حسینی کا تفصیلی تعارف: حضرت ہاشم پیر کا شمار جنوبی ہند کے ممتاز دعاۃ اور عرفا میں ہوتا ہے۔ ان کے تعارف اور ذکر کے بغیر بیجا پور کی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ ۹۸۴ھ/ ۱۵۷۵ء میں وہ احمد آباد گجرات میں پیدا ہوئے۔ ولادت کے بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا۔ بچپن میں گجرات بالخصوص احمد آباد مذہبی علوم کا گہوارہ تھا۔ علوم عقلیہ و نقلیہ کے اعتبار سے گجرات کو شیراز مانا جاتا تھا، تعلیم گاہوں کی کثرت تھی۔

ان کے چچا حضرت وجیہ الدین حسینی کا قائم کردہ مدرسہ "مدرسہ عالیہ علویہ"، تعلیم و تربیت کے

لحاظ سے عروج پر تھا۔ حضرت وجیہ الدین حسینی بنفس نفیس مسند ارشاد و تدریس پر جلوہ افروز تھے۔ ان کے والد ماجد برہان الدین حسینی بھی علم و عرفان لٹا رہے تھے، چچازاد بھائی حضرت عبداللہ حسینی علم و عمل اور حلم و بردباری کے اعتبار سے نمونہ عمل تھے۔ دادا شاہ نصر اللہ حسینی اور ان کے بھائی شمس الدین حسینی اپنے پیچھے تقویٰ و طہارت، اخلاص و للّٰہیت، خدمت خلق، تعلیم و تدریس، علوم و عرفان کی ایک تاریخ چھوڑ چکے تھے۔

تعلیم و تربیت اور اجازت و خلافت: ہاشم پیر نے جب ہوش سنبھالا تو والد نے قرآن اور دیگر ابتدائی تعلیم سے آراستہ کیا، پھر جید علما سے علم تفسیر، فقہ اور دیگر علوم متداولہ حاصل کیے، والد برہان الدین حسینی ۱۰۰۲ھ میں برہان پور منتقل ہوگئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۸ر سال تھی۔ وہ بھی اپنے والد کے ساتھ برہان پور چلے گئے۔ ہاشم پیر اپنی ابتدائی عمر ہی میں اپنے والد کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہو چکے تھے، پھر بعد میں دیگر علما و مشائخ سے روحانی نعمتیں بھی حاصل کیں۔

ہاشم پیر اپنے والد ماجد کے انتقال کے بعد ۱۰۰۹ھ میں اپنے چچازاد بھائی حضرت عبداللہ شاہ حسینی فرزند اکبر و جانشیں شاہ وجیہ الدین حسینی کے دامن سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے بھی ان کو پیروں کی نعمتوں سے سرفراز کیا، اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال تھی۔ ساری دنیا ہاشم پیر کو شطاریہ سلسلہ کے روشن چراغ کے طور پر جانتی ہے مگر ان کو قادریہ، چشتیہ، مغربیہ، سہروردیہ اور دوسرے سلاسل کی اجازت بھی حاصل تھی۔ اور جس طرح حضرت شاہ عبداللہ شطاری کو سلسلہ شطاریہ کا اور حضرت محمد غوث گوالیاروی کو غوثیہ کا بانی مانا جاتا ہے اسی طرح ہاشم پیر کو بھی سلسلہ ہاشمیہ کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔

حرمین شریفین کی زیارت اور شہر بیجاپور کی بشارت: حضرت ہاشم پیر متعدد بار حج بیت اللہ اور زیارت روضۂ رسول سے مشرف ہوئے۔ پہلی بار والد گرامی کی حیات میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، دوسری بار جب وہ حج کے لیے تشریف لے گئے تو روضہ نبویؐ سے بے شمار فیوض و برکات حاصل ہوئے، عالم بیداری میں رسول کریم ﷺ کی زیارت کی جس میں ان کو یہ حکم ملا کہ ہر دعوت کرنے والے کی دعوت کو تم قبول کرنا کیوں کہ سادات، مشائخ، زہاد اور عباد تمہاری دعوت کریں گے۔ اور تم دو سال مکہ معظّمہ میں قیام کے بعد میرے پاس حاضر ہو جاؤ، ایسا ہی ہوا مکہ میں قیام کے دوران علما و مشائخ نے ان کی خوب خاطر و مدارت کی۔ دو سال وقت گزار کر مدینہ شریف حاضر ہوئے، جب دیار حبیب میں

حاضر تھے تو شہر بیجاپور جانے کی بشارت ہوئی۔ ۱۳-۱۶۱۲ء/ ۱۰۲۱ھ میں وہ بیجاپور حاضر ہوئے، اس وقت بیجاپور میں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی حکومت قائم تھی اللہ کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو حضرت ہاشم پیر کی عزت وتکریم کرنے اور بیجاپور ان کی تشریف آوری کی بشارت خواب میں دے دی تھی۔ (حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ، ص:۷۶ تا ۹۱ ملخصاً)

قید سے رہائی اور گوا سے بیجاپور کا سفر: وہ جس جہاز سے آرہے تھے وہ گوا بندرگاہ پہ لنگرانداز ہوا جہاں حکومت کے کارندوں نے ان کو اوران کے دوستوں کو گرفتار کیا پھر بادشاہ کے حکم پر اپنے احباب کے ساتھ باعزت رہا ہوئے اور گوا سے بیجاپور نہایت تکریم کے ساتھ لائے گئے۔ گوا سے بیجاپور کے سفر کے درمیان انہوں نے جن مقامات پر قیام کیا تھا ان مقامات کی نشانیاں آج بھی باقی ہیں، جس سے ان کے سفر کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ (نفس مصدر، ص ۹۱)

عادل شاہی حکومت کی مذہبی حالت اور ہاشم پیر کی دعوتی خدمات: ابراہیم عادل شاہ فن موسیقی کا رسیا تھا، نجومیوں اور جوگیوں سے بڑا متاثر تھا، ''نورس'' نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں ہندو دیوی دیوتاؤں کا نام بڑے احترام سے تحریر کیا تھا، ہندو دیوی دیوتاؤں کی عبادتوں کو بھی پسند کرنے لگا، ہندو مذہبی تہواروں میں بھی شریک ہونا اس کے لیے عیب کی بات نہ رہ گئی۔

سلطان کے محل میں سرسوتی کی پوجا کی جاتی تھی، الغرض ہندو عوام سلطان ابراہیم عادل شاہ کو جگت گرو کے نام سے جانتے تھے۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کی یہ آزادخیالی اسے شرک وکفر کے دلدل میں پھنسا چکی تھی، سلطان کا یہ رویہ علما وصوفیہ کو ناگوار لگا، مساجد سے علمانے یہ اعلان کردیا کہ عادل شاہی حکومت میں اب دین محفوظ نہیں ہے ان علما میں حضرت صبغت اللہ روح اللہ بھڑوچوی سر فہرست ہیں جنھوں نے جمعہ کے دن عامۃ المسلمین سے خطاب کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی سلطنت میں شہر بیجاپور کی سرزمین پر اب دین اسلام محفوظ نہیں ہے۔

ایسے ماحول میں روحانی بشارت پاکر حضرت ہاشم پیر حسینی بیجاپور پہنچے اور سب سے پہلے امرا و سلاطین کی طرف توجہ دی، دعوت کا یہ اثر ہوا کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنے پورے کارندوں کے ساتھ تائب ہوا اوران کے حلقۂ ارادت میں شامل ہوگیا۔ (نفس مصدر، ص:۹۱ تا ۹۴ ملخصاً)

بادشاہ کا لڑکا محمد عادل شاہ بھی ان کے غلاموں میں شامل ہوا اور اس طرح شہر بیجاپور اور

عادل شاہی سلطنت کفر وگمرہی کے دلدل سے نکل کر علم وعرفان، توبہ وتزکیہ کے نورانی ماحول میں داخل ہوگئی اور پھر کیا تھا ابراہیم عادل شاہ ثانی کے اس دور حکومت میں شہر بیجاپور میں جو علما وصوفیہ تھے انہوں نے بھی پرامن طریقے پر اپنی داعیانہ سرگرمیوں کو تیز کر دیا اور ملک کے دیگر خطوں کے علما وصوفیہ نے شہر بیجاپور کو اپنا مسکن بنایا، خانقاہیں قائم ہوئیں، مدارس کی بنیادیں رکھی گئیں، خود بادشاہ نے بہت سارے علما و صوفیہ کو شہر بیجاپور کی دعوت دی اور اس دور میں ایران کی صفوی حکومت کا صوفی نظریات کی مخالفت، گجرات میں مغلوں کے حملے اور سلطنت بیدر کا داخلی انتشار کی وجہ سے مختلف علاقے کے عرفا وصوفیہ نے بیجاپور کو اپنی پناہ گاہ اور دعوت وتبلیغ کا مرکز بنایا، اس طرح شہر بیجاپور صرف علم وعرفان کا گہوارہ ہی نہیں بنا بلکہ مؤرخین کے نزدیک روضۃ الاولیا کے نام سے متعارف بھی ہوا۔

ابراہیم عادل شاہ کا صوفیہ کے ساتھ حسن سلوک: سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی نے صوفیہ کے ساتھ نہایت عقیدت ومحبت کا برتاؤ کیا۔ حضرت ہاشم پیر سے بادشاہ کو خاص عقیدت تھی۔ بادشاہ ہی کے پیہم اصرار پر حضرت ہاشم پیر نے بیجاپور کو بھی اپنا مسکن بنالیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے آبائی وطن احمد آباد کو خیرباد کہہ دیا۔ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی پر حضرت ہاشم پیر حسینی کی دعوت کا ایسا گہرا اثر ہوا کہ جب اس نے اپنا مقبرہ بنایا تو مقبرے کے داخلی باب پر یہ آیت کریمہ کندہ کرایا "ما کان ابراهیم یهودیا و لا نصرانیا ولکن کان حنیفا ....الخ، سلطان ابراہیم عادل شاہ ۴۷ سال حکومت کی جس وقت ہاشم پیر تشریف لائے اس وقت اس کی حکومت کا ۲۷ سالہ عرصہ گزر چکا تھا، ہاشم پیر سلطان کے ۲۰ سالہ دور حکومت میں موجود تھے اسی دوران سلطان نے اپنے مقبرے کی تعمیر شروع کی۔

ہاشم پیر کے چند معاصر علما ومشائخ: حضرت ہاشم پیر کے دور میں شہر بیجاپور مختلف سلاسل کے مندرجہ ذیل عظیم صوفیہ کا مسکن بنا ہوا تھا۔ ۱۔ شاہ عبدالرزاق قادری۔ ۲۔ شاہ مرتضیٰ قادری۔ ۳۔ شاہ قاسم قادری۔ ۴۔ شاہ ابوالحسن قادری۔ ۵۔ شاہ مصطفیٰ قادری۔ ۶۔ سید میر شطاری والد حضرت نعیم اللہ حسینی۔ ۷۔ سید احمد نظیر وغیرہ۔

یہ وہ حضرات تھے جو حضرت ہاشم پیر کے صرف معاصر ہی نہیں بلکہ معاون و مددگار اور مخلص دوست واحباب میں شامل تھے، یہ حضرات جمعہ کے دن جامع مسجد بیجاپور میں اکثر ملاقات کیا کرتے تھے۔

شاہ ابوالحسن قادری اور شاہ صبغۃ اللہ سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کی اصلاح اور اس کی رہنمائی کے سلسلے میں حضرت ہاشم پیر کے خصوصی معاون رہے۔ ان میں سے بعض کا ذکر ذیل میں قدرے تفصیل سے کیا جارہا ہے۔

ا۔ سید صبغۃ اللہ بھڑوچی: شاہ صبغۃ اللہ (وصال: ۱۶۰۶ء) کا شمار شاہ وجیہ الدین حسینی گجراتی کے ممتاز ترین خلفا میں ہوتا ہے۔ نام مجدالدین بن روح اللہ حسینی ہے، مدرسہ عالیہ علویہ کے تعلیم یافتہ اور وجیہ الدین گجراتی کے تربیت یافتہ تھے، حضرت وجیہ الدین نے ان کو روحانی نعمتوں سے نوازا تھا، ۹۹۹ھ میں مالوا حاضر ہوئے اور پھر احمد نگر ہوتے ہوئے بیجاپور تشریف لائے۔

بیجاپور قیام کے درمیان سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی اور اس کے دربار کو غیر اسلامی رسومات سے پاک کرنے کی بھرپور کوشش کی، ابراہیم عادل شاہ ثانی کی حکومت کا یہ ابتدائی دور تھا، اور اسی دور میں غیر اسلامی رسومات رواج پا رہے تھے، حکومت کی غیر اسلامی روش پر انہوں نے کھلے عام تنقید شروع کر دی تھی، پاداش میں عادل شاہی حکومت نے ان کو نظر بند کر دیا لیکن کچھ دنوں بعد اعزاز و اکرام سے نوازتے ہوئے حرمین شریفین جانے کا حکم فرمادیا، انہوں نے بادشاہ کے عطایات کو فقرا میں تقسیم کیا اور بے سروساماں حرمین کے لیے روانہ ہوگئے۔

زیارت سے مشرف ہونے کے بعد احد پہاڑ کے قریب مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کر لی، کتاب الوحدۃ، رسالہ ارادۃ الدقائق فی شرح مراۃ الحقائق وغیرہ ان کی تصنیفات سے ہیں، احمد شناوی، حسن قراقی، حبیب اللہ اور عبدالعظیم جیسے متبحر علما آپ کے شاگرد تھے۔ ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء میں مدینہ منورہ میں وصال ہوا۔ (تذکرہ علمائے ہند، ص: ۲۲۳ ملخصاً)

ان کے علاوہ دیگر بہت سارے معاصر علما و صوفیہ کے تذکرے ''روضۃ الاولیا بیجاپور'' میں مذکور ہیں۔

سلطان محمد عادل شاہ کی ہاشم پیر سے عقیدت: سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے وفات کے بعد محمد عادل شاہ تخت نشیں ہوا، محمد عادل شاہ کے دور حکومت ۱۶۲۷-۱۶۵۶ء میں عادل شاہ حکومت کو زبردست عروج حاصل ہوا۔ سلطان محمد عادل شاہ کے سامنے عظیم داعی و مصلح حضرت ہاشم پیر کی شخصیت موجود تھی۔ درباری رجحان میں تبدیلی کا جو سلسلہ سلطان ابراہیم عادل شاہ کی حکومت میں شروع ہوا تھا

وہ محمد عادل شاہ کے دور حکومت میں حضرت ہاشم پیر کی سرپرستی میں جاری رہا۔

سلطان محمد عادل شاہ ثانی ایک زمانے سے بیمار تھا، خدمت میں حاضر ہو کر کہنے لگا حضور کی توجہ اور دعا کے سوا دوسری کوئی تدبیر نظر نہیں آتی، کرم فرمایئے تا کہ شفا پاؤں وہی نظر عنایت خاص فرمائیں جو میرے باپ پر تھی، اپنے لیے ایک مقبرہ بنانے کا ارادہ ہے حکم ہو تو کام شروع کرادوں، حضرت نے فرمایا زندگی وفا کرے تو عاقبت کا بھی خیال رکھنا چاہیے کیوں کہ ملک الموت کا سامنا ہونا ہے، سلطان نے کہا یہی ایک آرزو باقی رہ گئی ہے۔

حضرت نے فرمایا میری عمر کے دس سال باقی ہیں وہ میں نے تم کو بخشے اور تمہارا مرض میں نے اپنے اوپر لے لیا، کیوں کہ فقیر سے تمہارے والد بڑی محبت اور مہربانی سے پیش آئے ہیں یہ اس کا بدل ہے، تمہاری عمر پوری ہو چکی ہے تو یہ جان بخشی ہے یہ کہہ کر اس کا مرض اپنے اوپر لے لیا، بادشاہ کو صحت ہونے لگی۔ دوسرے روز سلطان حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت کے جسم میں اذیت ناک درد ہے، اپنی جگہ حرکت تک نہیں کر سکتے، سلطان نے معذرت کی، آپ نے فرمایا:

موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست کے پاس پہنچا دیتا ہے، اس واقعہ سے بادشاہ اور امرا نے سمجھا کہ اللہ کے دوست دوسروں کا بار محض اللہ کے لیے اپنے اوپر لیتے ہیں، ان کے لیے رنج و راحت، حیات و موت سب یکساں ہے حضرت اسی مرض میں دوسرے تیسرے دن جمعہ کے روز ۹/ رمضان المبارک ۱۰۵۶ھ واصل حق ہوئے۔ "بادشاہ اہل بہشت" (۱۰۵۶ھ) تاریخ وصال ہے۔ روضہ محلہ بادشاہ پور، بیجاپور میں مرجع خلائق ہے۔

حضرت کی اس نوازش خاص کا اس صورت میں ظہور ہوا کہ ان کی عطا کردہ زندگی کے دس سال نے سلطان محمد عادل شاہ ثانی کی اس طرح تکمیل آرزو کی اور ایسا بامراد بادشاہ بنایا کہ جس مقبرہ کی تعمیر کی تمنا تھی، اس کی تکمیل ہوئی، جو آج بھی شہر بیجاپو میں موجود ہے "بول گنبد" یا "گول گنبد" سے مشتہر ہے، دنیا کے عجائبات میں ہے، ایسا شاندار گنبد دنیا میں کہیں نہیں، یوں ہی ابراہیم عادل شاہ ثانی کا مقبرہ بھی تاج محل کے بعد دنیا کی خوبصورت عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص:۲۵۸-۲۵۹)

وصال: جب ہاشم پیر کی عمر پچاس سال کی ہوئی تو (۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) میں بیجاپور سے حج بیت اللہ

کے لیے ایک بار پھر روانہ ہوئے، اس بار بھی آپ نبی کریم ﷺ کے خصوصی عنایات سے سرفراز کیے گئے۔ ۹/رمضان المبارک ۱۰۵۶ھ مطابق ۲۰/اکتوبر ۱۶۴۶ء کو حضرت ہاشم پیر حسینی کا وصال ہوا، اس وقت عمر شریف ۷۲ سال کی تھی۔ (حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ،ص:۱۰۱)

ان کے بعد صاحبزادے حضرت مصطفیٰ حسینی نے ان کی نعمتوں کو عام مخلوق تک پہنچانے کی بھرپور کوشش کی، روحانی فیضان کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

حضرت ہاشم پیر کے اولاد واخلاف: حضرت ہاشم پیر کے دو لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں:

۱۔شاہ مصطفیٰ اول ۲۔شاہ مرتضیٰ اول۔شاہ مرتضیٰ اول کے ایک لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں، لڑکے کا نام شاہ برہان الدین۔

☆شاہ مصطفیٰ حسینی بن ہاشم کے ۱۲/لڑکے ہوئے: ۱۔حبیب اللہ ۲۔عنایت اللہ ۳۔فہیم اللہ ۴۔من اللہ ۵۔خلیل اللہ ۶۔فضل اللہ ۷۔اسداللہ ۸۔کریم اللہ ۹۔عصمت اللہ ۱۰۔فتح اللہ ۱۱۔ولی اللہ ۱۲۔حکم اللہ۔

☆شاہ برہان الدین حسینی بن مرتضیٰ حسینی اول کی چار شادیاں تھیں۔ان کے چھ صاحبزادے ہوئے: ۱۔مصطفیٰ حسینی دوم ۲۔ابومحمد ۳۔ابوتراب ۴۔عبدالنبی ۵۔عبدالقادر ۶۔مرتضیٰ حسینی دوم۔

☆شاہ مرتضیٰ حسینی دوم ابن شاہ برہان الدین حسینی اول کے تین صاحبزادگان تھے: ۱۔حضرت شاہ حسینی ۲۔شاہ ہاشم حسینی دوم ۳۔شاہ وجیہ الدین حسینی دوم۔

☆شاہ وجیہ الدین دوم بن مرتضیٰ حسینی دوم کی دو شادیاں تھیں، جن سے پانچ صاحبزادیاں اور دو صاحبزادے ہوئے: ۱۔محمد غوث حسینی ۲۔عبداللہ حسینی۔

☆شاہ عبداللہ حسینی ابن وجیہ الدین دوم حسینی کی بھی دو شادیاں تھیں جن سے چھ صاحبزادگان ہوئے: ۱۔وجیہ الدین کلاں سوم ۲۔وجیہ الدین خرد چہارم ۳۔محمد غوث کلاں دوم ۴۔محمد غوث خرد سوم ۵۔مرتضیٰ حسینی سوم ۶۔محمد حسینی۔

☆وجیہ الدین حسینی کلاں سوم بن عبداللہ حسینی کے دو صاحبزادے ہوئے: ۱۔وجیہ الدین حسینی گجراتی پنجم ۲۔وجیہ الدین حسینی ششم۔

☆وجیہ الدین حسینی گجراتی پنجم کے اولاد نرینہ نہ تھی۔

☆ وجیہ الدین حسینی ششم کے ایک لڑکے تھے: ۱۔ شاہ عبداللہ حسینی دوم، جن کے تین لڑکے ہوئے۔ ۱۔ وجیہ الدین حسینی ہفتم ۲۔ مرتضیٰ حسینی چہارم ۳۔ مصطفیٰ حسینی دوم، شاہ وجیہ الدین حسینی ہفتم کا وصال بچپن ہی میں ہو گیا، مرتضیٰ حسینی چہارم مسند سجادگی پر رونق افروز ہوئے، اور شاہ مصطفیٰ حسینی دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت میں اپنے بھائی صاحب سجادہ مرتضیٰ حسینی چہارم کے معاون رہے۔

☆ مصطفیٰ حسینی دوم کے ۴ صاحبزادے ہوئے: ۱۔ ہاشم حسینی دوم ۲۔ عبدالباری ۳۔ وجیہ الدین ہشتم ۴۔ برہان الدین دوم۔

☆ ہاشم حسینی دوم ابن مصطفیٰ حسینی دوم کے دو صاحبزادے ہوئے: ۱۔ معین الدین جو خانقاہ ہاشمیہ، بیجاپور کے موجودہ متولی ہیں۔ ۲۔ مصطفیٰ حسینی دوم۔

☆ شاہ عبدالباری حسینی کے صاحبزادے افضل پیرزادہ جو "حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ: ایک مطالعہ" نامی کتاب کے مصنف اور سید تنویر ہاشمی صاحب کے چچازاد بھائی اور بڑے معاون تھے، ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء کو انتقال ہوا راقم السطور جس دن خانقاہ ہاشمیہ حاضر ہوا اس دن ان کے سوئم کی فاتحہ تھی۔

☆ شاہ وجیہ الدین ہشتم کے دو لڑکے ہوئے: ۱۔ ظہور حسینی ۲۔ نصر اللہ حسینی۔

☆ شاہ برہان الدین حسین کے دو لڑکے ہوئے: ۱۔ پروفیسر غوث حسینی ۲۔ حضرت شاہ محی الدین عرف سید تنویر ہاشمی۔

سلسلہ ہاشمیہ کی ایک متحرک و فعال شخصیت: شاہ محی الدین عرف سید تنویر ہاشمی (ولادت: ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء) جو اس وقت خانقاہ ہاشمیہ بیجاپور کے نہایت متحرک و فعال فرد، خلیق و حریص داعی و مربی ہیں، ہاشم پیر ۱۲ واسطوں سے ان کے جد اور ۱۱ واسطوں سے ان کے مرشد ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ دعوت و تبلیغ کا بڑا کام انجام پا رہا ہے۔ تعلیم و تبلیغ کے میدان میں مختلف محاذ پر سرگرم عمل ہیں، ظاہری وجاہت اور طبعی طہارت کے حامل ہیں، صوفیانہ عادت و اطوار، اعتدال و وسطیت کے حامل اور اس کے مبلغ ہیں۔ راقم السطور کی متعدد ملاقاتیں ہیں، امید یہ ہے کہ ان کے ذریعہ متقدمین صوفیہ کی روحانی نعمتوں اور ان کی تعلیمات کو بڑے پیمانے پر بیجاپور اور اس کے اطراف بلکہ پورے کرناٹک میں فروغ ملے گا اور خلق خدا کی رشد و ہدایت کا کام انجام پائے گا، یہ جہاں اپنے مشائخ کی نعمتوں کے وارث و امین ہیں وہیں دور حاضر کے صوفیہ و عرفا کی صحبت فیض سے مستفیض ہونے کا حریصانہ جذبہ بھی رکھتے ہیں۔

شاہ محی الدین عرف سید تنویر ہاشمی کے تین صاحب زادگان ہیں: ۱۔عبداللہ ۲۔سید عریض حسینی ۳۔عمادالدین۔

خانقاہ ہاشمیہ کی سجادگی اور تولیت کی روایت: سلسلہ ہاشمیہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ہاشم پیر سے آج تک تولیت اور سجادگی میں اس بات کا خیال رکھا جاتا رہا ہے کہ شیخ طریقت کے جو بڑے صاحبزادے ہوں گے وہی اس خانقاہ کے متولی اور سجادہ ہوں گے، خواہ اس خانوادے میں اس وقت بڑے صاحبزادے سے زیادہ لائق وفائق دوسرے افراد موجود ہوں، اجازت و خلافت تو کسی بھی اہل کو دی جاتی رہی ہے لیکن تولیت اور سجادگی کا حقدار بڑا لڑکا ہی قرار پایا ہے، یہ طریقہ متولی بنانے تک تو سمجھ میں آتا ہے، ممکن ہے فتنے سے بچنے کے لیے یہ طریقہ متعین کردیا ہو، لیکن سجادگی کا معاملہ کم سمجھ میں آتا ہے، ویسے اس معاملے کو اہل طریقت ہی بہتر جانتے ہیں۔

سلسلہ ہاشمیہ شطاریہ کی تعلیمات: ذیل میں سلسلہ ہاشمیہ شطاریہ کے بعض مشائخ کی چند تعلیمات بیان کی جارہی ہیں، جو سالکین راہ طریقت کے لیے رہنما اصول ہیں:

۱۔ ''معدن الاسرار'' میں قاضن علا شطاری فرماتے ہیں: ایک درویش کامل کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ظاہر احکام شرع کے عین مطابق ہو اور باطن ابدی حقیقت سے آشنا ہو، حقیقت کے راستے پر گامزن ہونے سے ہی معرفت کا حصول ممکن ہے۔ انھوں نے شریعت کو کشتی، طریقت کو سمندر اور حقیقت کو اس سمندر کی تہ میں پائے جانے والے موتی سے تشبیہ دی ہے۔ (معدن الاسرار، بحوالہ حضرت ہاشم پیر، ص:۲۷)

۲۔ جو ارشاد و تلقین کا کام کرتے ہیں انہیں اپنی درویشی کو سر عام بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ اظہار کرامت سے پرہیز کرتے ہوئے اپنے مریدین و متوسلین کی رہنمائی پر زیادہ زور دینا چاہیے، درویشی کو دوکانداری اور کرامت فروشی کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے اور اگر ایسا ہونے لگا تو روح تصوف مر جائے گی۔ (معدن الاسرار، بحوالہ، حضرت ہاشم پیر، ص:۲۷)

۳۔ حضرت بہاؤالدین نے رسالہ شطاریہ میں ان ضوابط و قواعد کو ضابطۂ تحریر میں لایا ہے جو سلسلہ شطاریہ کے مقصد عین کے حصول کے لیے از حد ضروری ہے۔ ۱۔ توبہ و استغفار، یعنی ماسوا اللہ سے علاحدہ وجدا ہوجانا۔ ۲۔ زہد، دنیا کی تمام خواہشات سے کنارہ کش ہوجانا۔ ۳۔ توکل، یعنی اسباب

دنیا کو ترک کر دینا۔ ۴۔قناعت، یعنی تمام خواہشات نفسانیہ کو چھوڑ دینا۔ ۵۔عزلت، یعنی لوگوں سے دور رہنا۔ ۶۔توجہ الی الحق، یعنی صرف خدا ہی کی ذات کو اپنا مقصود و مطلوب بنا لینا۔ ۷۔صبر، یعنی مجاہدہ کے ذریعہ نفس کی تمام مسرتوں اور خوشیوں کو کچل دینا۔ ۸۔رضا، یعنی اپنے تمام ارادوں کو ختم کر کے تا حیات خدا کے احکام کی پیروی کرنا۔ ۹۔ذکر، یعنی اللہ کے سوا سب کچھ پس پشت ڈال دینا۔ ۱۰۔مراقبہ یعنی اپنے وجود اور اپنی ذات کو ختم کر دینا اور اپنے آپ کو مردہ تصور کرنا۔ مزید فرماتے ہیں کہ ایک سالک کو چاہیے کہ وہ ان تین امور کو اختیا کرے اول تقویٰ، دوم توکل وقناعت، سوم عزلت گزینی۔ ان تینوں امور کا اثر اس کے ظاہر و باطن پر صاف نظر آئے گا انہیں کو بنیاد بنا کر تصوف کی شاندار عمارت کو تعمیر کیا جاسکتا ہے۔ (حضرت ہاشم پیر، ص:۲۹ ملخصاً)

۴۔خیال غیر کو کبھی بھی اپنے دل میں داخل نہ ہونے دے، نفع ہو کہ نقصان، خیر ہو کہ شر، تکلیف ہو کہ راحت، مخلوق کی جانب سے اسے نہ سمجھے۔ اتنا علم ضرور حاصل کرے کہ مذہب اہل سنت و جماعت کے متعلق اپنے عقائد کو درست رکھے۔ احکام شریعت کو اپنا پیشوا بنائے۔ غیبت و بہتان، تمام غیر شرعی امور اور لہو ولعب سے پرہیز کرے۔ غیر محبوب کی طرف مائل ہونے سے دل کی پاسبانی کرے، مومن کا قلب اللہ کا حرم ہے اور اللہ کے حرم میں غیر اللہ کا داخلہ حرام ہے۔ اگر مرشد موجود نہ ہو تو حضرت شرف الدین یحیٰ منیری کے مکتوبات کا مطالعہ کرے۔ (اوراد غوثیہ بحوالہ حضرت ہاشم پیر، ص:۷۳ تا ۸۳ ملخصا)

۵۔اگر تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے کرامات دی گئی ہیں، یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہو پھر بھی تم اس سے دھوکہ نہ کھانا، یہاں تک کہ تم یہ دیکھ نہ لو کہ وہ اوامر ونواہی، حدود اللہ کی حفاظت اور شریعت کی پابندی میں کیسا ہے۔

۶۔اگر کسی سے اپنے عیبوں کے بارے میں خود سنو تو تمہیں چاہیے کہ اس پہ غصہ نہ کرو، انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ ضبط وتحمل سے کام لو، اگر وہ شخص سچ بول رہا ہے تو اس کے یہ بول تمہارے اصلاح کا ذریعہ بنیں گے، اور اگر اس میں سچائی نہ ہو تو تمہارا صبر وتحمل تمہارے لیے آخرت میں بلندی درجات کا سبب ہوگا۔ (ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۴۷)

۷۔مرید جب پیر کے ہاتھ پر ہاتھ دے تو وہ خود مردہ اور اپنے پیر کو غسال جانیں اور پیر کے

حکم کو خدا اور رسول کے حکم کے مترادف جانے، پیر سے آخرت میں بہتری طلب کرے، بعداز بیعت خود کو گناہوں سے بچائے، پیر کے ہر فعل پر نظر رکھے، جو کام اس کا پیر کرتا ہے اسے کرے اور جس کام سے پیر دور رہتا ہے اس سے وہ بھی دوری اختیار کرے۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۴۸)

۸۔اگر کوئی صائم الدہر، قیام اللیل، عالم، مفسر، محدث اور فقیہ ہی کیوں نہ ہو اگر وہ بغیر ارادت کے ہے تو وہ صاحب طریق نہیں ہوسکتا۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۴۷)

۹۔ایک مرید کو چاہیے کہ وہ خوش عقیدہ ہو بدعقیدگی سے کچھ حاصل ہونے والا نہیں، بہت سارے مشائخ کے حوالے سے وہ فرماتے ہیں کہ اگر انڈا اگندہ ہو اور ساری دنیا کے مرغ مل کر انڈے کو سینکیں تو بھی اس میں بچہ نکلنے والا نہیں۔ٹھیک اسی طرح ایک بدعقیدہ شخص کو منزل مراد نہیں ملتی ہے۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۴۹)

۱۰۔مرید کو چاہیے کہ اپنے جملہ احوال پیر پر ظاہر کرے تا کہ ساعت بہ ساعت روز بروز، اس کی ضرورت کے حساب سے تربیت ہو، مرید کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے دل میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات وخطرات سے پیر کو آگاہ کرتا رہے۔ایک مرید کو چاہیے کہ وہ اپنے خوابوں سے پیر کو واقف کرائے۔اور جب تک اس کا پیر اسے مشورہ نہ دے اپنے خواب کو دوسروں پر ظاہر نہ کرے۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۵۰)

۱۱۔مرید کو چاہیے کہ وہ پیر کا تصور کرے پیر کی حضوری میں باادب رہے اور جدائی میں پیر کا خیال رکھے۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۵۱)

۱۲۔پیر کے حکم میں مصلحت خداوندی ہوتی ہے، تمام مرشدان برحق اس بات پر متفق ہیں کہ ایک پیر کامل اپنے مرید کی صلاحیت دیکھ کر اس کی تربیت کرتا ہے اور راہ سلوک کی منازل طے کراتا ہے مثلاً کسی مرید سے کہا جاتا ہے کہ تم بازار میں بیٹھ جاؤ اور کسی دوسرے سے کہا جاتا ہے کہ تم تنہائی اختیار کرلو۔(ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص:۱۵۰)

۱۳۔ہاشم پیر سے جب پوچھا گیا کہ ذکر کا کونسا طریقہ اچھا ہے تو فرمایا: کہ ذکر خفی بہترین ہے، ارشاد فرماتے ہیں: کہ مسلمانی بنیاد ایمان ہے اور ایمان کی سلامتی کے لیے ذکر ضروری ہے، نماز کا مقصد ذکر ہے اور نماز ذکر کے لیے ہے، قرآن کا پڑھنا افضل ترین ذکر ہے......دوستی کا تقاضہ اور دوستی کی علامت

یہ ہے کہ دوست ہر حال میں اپنے دوست کا ذکر کرے (ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص: ۱۵۳)

سماع کے تعلق سے حضرت ہاشم پیر کی تعلیم: افضل پیرزادہ تحریر کرتے ہیں: کہ حضرت ہاشم پیر کے ملفوظات میں سماع پر کافی تفصیلی بحث ملتی ہے، سماع چشتیہ سلسلے کی ایک امتیازی نشانی ہے، ان کے پردادا حضرت عمادالدین حسینی اور دادا حضرت نصر اللہ حسینی کو اپنے سلسلے میں داخل کرتے ہوئے حضرت قاذن چشتی نے اپنے روحانی تصرفات کا استعمال کرتے ہوئے فرمایا تھا: کہ قیامت تک پیدا ہونے والی ان کی اولاد کو چشتی سلسلے میں داخل کرلیا ہوں، اس لیے حضرت ہاشم پیر کا سماع کی طرف مائل ہونا ایک فطری امر ہے...... ان کے خادموں میں نقیب نامی ایک قوال بھی تھا۔

سماع کے متعلق حضرت ہاشم پیر ارشاد فرماتے ہیں: کہ سماع ایک خاص کیفیت کا نام ہے جب وہ وارد ہوتی ہے تو وجود بشریت کو ختم کر جاتی ہے، رعونت اور نفسانیت کا علاج کرتی ہے، محبوب کی طرف محب کے لیے سماع ایک وسیلہ ہے، محبوب کا قرب پانے کا ایک ذریعہ ہے، سماع رحمٰن کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔ ہاشم پیر کے نزدیک سماع اس باران نیساں کی طرح ہے جو دلوں پر صدف کی بارش برساتا ہے سماع کے کئی شرائط مقرر کیے گئے ہیں، جس میں ایک یہ بھی ہے کہ دل ہر دو جہاں سے فارغ ہو۔

نقل کیا گیا ہے کہ ایک بادشاہ کسی چشتی بزرگ کی خدمت میں قحط سالی کے زمانے میں بارش کی دعا کی درخواست لیے حاضر ہوا، بزرگ اپنے متوسلین کو سماع کی محفل سجانے کا فرمان سناتے ہوئے بادشاہ کو محفل سے اٹھ جانے کا حکم دیتے ہیں، بادشاہ کے دریافت کرنے پر وہ چشتی بزرگ بتاتے ہیں کہ سماع اہل لطافت کی محفل ہوتی ہے، اہل کثافت کا اس محفل میں کوئی کام نہیں ہوتا ہے، سماع کے دوران اس چشتی بزرگ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا نکلنا ہی تھا کہ رحمت خداوندی بارش کی شکل میں برسنے لگی۔ (ملفوظات ہاشم پیر بحوالہ نفس مصدر، ص: ۱۵۵-۱۵۶)

حواشی

(۱) شطر کی تحقیق: یہ عربی لفظ ہے جس کے معنی طرف اور کنارہ کے ہیں، اس لفظ کا استعمال قرآن پاک میں بھی ہوا ہے، تحویل قبلہ کی ایک آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب ہوا: فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ، اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔

مناہج الشطار کے مصنف نے اس کی تفصیل یوں بیان کی ہے: شُطّار شاطر کا صیغۂ مبالغہ ہے۔ اَلشَّطْر کے معنی جانب اور طرف اور کنارہ کے ہوتے ہیں، جب طالب حق ہر طرف سے منہ موڑ کر جمال الٰہی کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوجاتا ہے، چونکہ اس میں وہ فنائے نفس و ہوا اور امانت معدوم سے ہوکر ملاحظۂ توحید اور ذات وصفات الٰہی میں لگ جاتا ہے، اللہ کے سوا کسی بھی جانب نہیں دیکھتا اور واصل حقیقی ہوجاتا ہے۔ اس لیے شُطّار کا اطلاق اس پر ہونے لگتا ہے۔ حضرت نجم الدین کبریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ میں شُطّار کا لفظ اخیار و ابرار کے ساتھ استعمال ہوا ہے اور یہ تمام الفاظ جمع ہیں چنانچہ شطار بھی جمع ہوا، شاطر کی پیش کے ساتھ۔ جیسا کہ جُہال، عُقال اور حُکام، جاہل، عاقل اور حاکم کی جمع ہے پیش کے ساتھ تاکہ ابرار و اخیار کے ساتھ حسن مقابلہ ہوسکے۔ شطار شطرنج باز اور تیز دوڑنے والے اونٹ اور شوخ بچہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ ان لوگوں کے لیے (معنوی طور سے) استعمال کیا گیا ہے جو معرفت ذات الٰہی کے لیے جہاد (بالنفس) کرتے ہیں کیونکہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انہیں بعد مرگ طبعی آخرت میں اپنی رویت و مشاہدہ سے نوازے گا۔ چونکہ اس گروہ کے لوگ ارادتاً آخرت کے بدلے دنیا میں مرگ ارادی حاصل کرلیتے ہیں اور وعدۂ آخرت پانے کی کوشش کرتے ہیں لہٰذا اس معنی و مفہوم کے اعتبار سے یہ شوخ، تیز رو اور باشندۂ خودی کہلاتے ہیں۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۴۱۔۴۲)۔ (۲) ان کا نام نامی شیخ محمد علاء ہے، شیخ قاذن کے نام سے ان کی شہرت ہوئی یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ علاء علاء الحق یا علاء الدین کا مخفف ہے یا نام ہی محمد عُلاء ہے۔ اسی طرح قاذن کہیں ذال سے لکھا ملتا ہے تو کہیں ضاد سے، یہ شاہ عبد اللہ شطاری کے بڑے عظیم المرتبت خلیفہ گزرے ہیں۔ (۳) شاہ قاضن چشتی مرید و خلیفہ شیخ علم الدین جن کا مزار پٹن میں ہے، حضرت شاہ قاضن چشتی ان (نصر اللہ حسینی) پر نہایت مہربان تھے اور اکثر حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ان کی اولاد مجھ کو مثل اپنی اولاد سے پیاری ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۱۶۷)۔ (۴) وجیہ الدین علوی گجراتی کی تاریخ پیدائش صاحب تذکرہ علمائے ہند نے ماہ محرم ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء تحریر کیا ہے۔ اور ''حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ: ایک مطالعہ'' کے مصنف نے ۲۲ محرم الحرام ۹۱۰ھ مطابق ۱۵۰۴ء لکھا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۵) غوث گوالیاروی کی تصنیف ''معراج نامہ'' کی چند عبارتوں پر اس وقت کے علما کو شدید اعتراض تھا، جس کی وجہ سے ان کی تکفیر کی گئی، پورے واقعہ کو افضل پیرزادے نے یوں تحریر کیا ہے: معراج نامہ کی چند عبارتوں کو لے کر شیخ علی متقی، شیخ عبد المقتدر، بیابانی اور ملک زین العابدین وغیرہ علما نے کفر کا فتویٰ دیا، بادشاہ وقت پر دباؤ ڈالا گیا کہ محمد غوث گوالیاروی کے قتل کا حکم جاری کیا جائے، سلطان وقت نے اس فتویٰ کو وجیہ الدین حسینی کے پاس استصواب کے لیے بھیجا، وہ فتویٰ لے کر حضرت محمد غوث کی خدمت میں حاضر ہوئے، جب انہوں نے ان کو دیکھا تو اس قدر شیفتہ ہوئے کہ اس فتوے کو

چاک چاک کرڈالا اور حضرت محمد غوث گوالیاروی کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ شیخ علی متقی کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو حضرت وجیہ الدین حسینی کے پاس آکر اپنے کپڑوں کو تار تار کرڈالا اور پوچھا: بدعت کی اشاعت اور دین میں رخنہ پیدا کرنے میں تم کس طرح راضی ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اربابِ قال ہیں، شیخ اہل حال ہیں، ہماری سمجھ ان کے کمالات تک نہیں پہنچ سکتی ہے اور بظاہر شریعت کا کوئی اعتراض ان پر عائد نہیں ہوتا۔ اس طرح وجیہ الدین حسینی کے اثر سے گجرات کے تمام حکام بھی محمد غوث کے معتقد ہو گئے، وجیہ الدین حسینی کے ملفوظات میں ہے کہ فرماتے ہیں کہ محمد غوث کی ملاقات سے پہلے مجھے اللہ کی کچھ بھی معرفت حاصل نہ تھی جس نے مجھ کو اللہ تعالیٰ تک پہنچایا وہ محمد غوث گوالیاروی ہی ہیں۔ (تذکرۃ الوجیہ، ص: ۸۷ بحوالہ حضرت ہاشم پیر اور سلسلہ شطاریہ: ایک مطالعہ، ص: ۵۶)۔ (۶) میر سید یاسین سامانی وہ شیخ ہیں جن سے سلسلہ شہبازیہ کے بانی حضرت شہباز محمد بھاگل پوری کو سلسلہ شطاریہ کی اجازت وخلافت پہنچی۔ سلسلہ شہبازیہ کا فیضان بہار کے بڑے خطے میں عام رہا ہے، زمانہ قریب کے بڑے خطیب اور متبحر عالم حضرت مولانا اشتیاق عالم بھاگل پوری اسی سلسلے کے شیخ تھے۔ (۷) ''جاپانیر بہ فتح جیم معجمہ عربی و یای فارسی مفتوحہ بین الفین و کسر نون یای تحتانی مجہول و در آخر رای مہملہ، گجرات دکن میں ایک شہر ہے (تذکرہ علمائے ہند، ۴۵۶-۴۵۷م)۔ (۸) حضرت شیخ علاؤالدین المعروف علاء قاذن شطاری کے سلسلہ نسب کے بارے میں مولانا اشتیاق عالم شہبازی تحریر کرتے ہیں: ان کا نسب امام ابودرداء ابومصعب رضی اللہ عنہ پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کی تصدیق کرسی نامہ سادات دیورا (قلمی) سے بھی ہوتی ہے جس میں یوں تحریر ہے: حقیقت شیخ ابوالفتح قدس سرہٗ بن شیخ محمد علاء معروف بہ شیخ قاذن نسبت ایشاں بہ امام ابودرداء ابومصعب عم رسول ﷺ منتہی است لیکن مشایخ بہار کے مؤلف ڈاکٹر طیب ابدالی مرحوم نے ایک دوسری بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ حضرت امام محمد تاج فقیہ کے چار صاحبزادگان تھے۔ پہلے حضرت مخدوم شاہ اسرائیل، جن کے صاحبزادہ حضرت یحییٰ منیری ہیں اور دوسرے صاحبزادہ مخدوم شاہ اسماعیل ہیں، ان کے صاحبزادے شاہ صلاح الدین تھے، ان کی اولاد میں حضرت شیخ قاذن شطاری مشہور شطاری بزرگ گزرے ہیں۔ انہوں نے چھوٹے صاحبزادے شاہ عبدالعزیز کو بتایا ہے انہیں کہ صاحبزادگان مخدوم جلال منیری اور سلیمان لنگرزمین ہیں۔ مؤلف تذکرہ مشایخ بہار کے مطابق حضرت قاذن شطاری کا خاندان حضرت امام محمد تاج فقیہ کے خاندان سے ملتا ہے۔ اور یہ خاندان ابومسعود بن ابوذر بن زبیر عم محترم رسول ﷺ پر منتہی ہوتا ہے۔ دونوں شجرۂ نسب میں آخر کے دو نام مختلف ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کنیت یا لقب ہو، جسے نام کے بجائے استعمال کیا گیا ہو۔ پھر بھی یہ بات تحقیق طلب ہے۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص: ۵۴)۔ (۹) حضرت ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست یہ وہ بزرگ ہیں جن سے شطاری فیضان منعم پاک باز بانی سلسلہ منعمیہ میتن

گھاٹ پٹنہ کو مندرجہ ذیل واسطوں سے پہنچتا ہے: ۱۔ دیوان خلیل ۲۔ دیوان جعفر ۳۔ دیوان اہل اللہ ۴۔ سید اشرف ۵۔ شیخ ابوالفتح ہدایت اللہ۔ (۱۰) حضرت فضل اللہ گوسائی سے ہوتے ہوئے سلسلہ شطاریہ کا فیضان حضرت منعم پاک باز کو مندرجہ ذیل واسطوں سے پہنچتا ہے: ۱۔ دیوان خلیل ۲۔ دیوان جعفر ۳۔ دیوان اہل اللہ ۴۔ نظام الدین بہاری ۵۔ تقی الدین بہاری ۶۔ نصر اللہ بہاری ۷۔ محمود بہاری ۸۔ فضل اللہ گوسائی ۹۔ قاضی اعلیٰ شطاری، ویشالی، بہار۔ خانقاہ منعمیہ جن کے مشائخ کا فیضان بہار کے ایک بڑے خطے میں اہل دل کی رہنمائی کرتا رہا ہے۔ دورِ حاضر کے عظیم خطیب حضرت علامہ ڈاکٹر سید شمیم الدین منعمی اسی خانقاہ کے سجادہ نشیں اور شیخ طریقت ہیں۔ (۱۱) حضرت علا قاضن کے وصال کی تاریخ میں مورخین کا اختلاف ہے، افضل پیرزادے نے ۹۰۳ھ/ ۱۴۹۶ء تحریر کیا ہے جبکہ ''آیات الٰہی کے نگہبان'' کے مصنف نے ۹۰۱ھ/ ۱۴۹۵ء تحریر کیا ہے (ص:۵۲)۔ (۱۲) شاہ ظہور حاجی حضور نے اپنے پیرزادے ابوالفتح ہدایت اللہ سرمست کی خوب خدمت کی اور جب انہوں نے سفر حرمین کا ارادہ فرمایا اور اپنے پیرزادے سے اجازت حاصل کرنا چاہی تو شاہ ابوالفتح نے ان کو اپنی خلافت و اجازت اور خرقہ عطا فرمایا اور سفر کی اجازت دی۔ (آیات الٰہی کے نگہبان، ص:۶۰ ملخصاً)

کتابیات

(۱) ترجمہ روضۃ الاولیائے بیجاپور، محمد ابراہیم بیجاپوری / مترجم: شاہ سیف اللہ قادری، ناشر: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد ۲۰۱۰ء۔ (۲) اخبار الاخیار فی اسرار الابرار (فارسی)، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند۔ (۳) تاریخ صوفیائے گجرات، ڈاکٹر شاہ ظہور الحسن شارب، ناشر: کلیم بک ڈپو اینڈ آفسیٹ پرنٹرس، خاص بازار، احمد آباد، ۲۰۱۳ء۔ (۴) تذکرۂ قطب دکن الموسوم بہ حالات ہاشم پیر دستگیر بیجاپور، شاہ مصطفیٰ حسینی ۱۹۴۳ء۔ (۵) ملفوظات شریفہ، شیخ وجیہ الدین احمد علوی، مترجم: مولانا عبد السلام رضوی، ناشر: امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر، بریلی۔ (۶) تذکرۃ الوجیہ، سید حسینی پیر علی، گجرات اردو اکیڈمی (حکومت گجرات) ۱۹۹۰ء۔ (۷) آیات الٰہی کے نگہبان، مولانا محمد اشتیاق عالم شہبازی، ناشر: مولانا ولی العالم اکیڈمی، خانقاہ عالیہ شہبازیہ، ملا چک شریف، بھاگل پور، ۲۰۱۰ء۔ (۸) تذکرہ علمائے ہند (مترجم)، مولوی رحمان علی، ڈاکٹر محمد ایوب قادری، مطبع شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۳ء۔ (۹) حضرت ہاشم پیر اور سلسلۂ شطاریہ ایک مطالعہ، سید افضل پیرزادے ہاشم، ادارہ ادبیات دلی، صدر بازار، دہلی، ۲۰۱۵ء۔ (۱۰) الافاضات الاحمدیہ، شرح الحقیقۃ المحمدیۃ، شیخ مرزا محمد دائم الہندی، تحقیق: مولانا جلال رضا ازہری، مطبع الکیلامی، قاہرہ، ۲۰۰۷ء۔

آہ! پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن

علمی دنیا کو یہ خبر سن کر نہایت افسوس ہوا کہ علی گڑھ کے نامور اسلامی اسکالر اور سیرت نبویؐ کے قابل فخر عالم دین پروفیسر ڈاکٹر یٰسین مظہر صدیقی ندوی کا اچانک ۱۵ر ستمبر ۲۰۲۰ء کو ساڑھے بارہ بجے دن میں علی گڑھ میں انتقال ہو گیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی نے دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے عربی علوم وفنون کی تکمیل کی۔ اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے ہسٹری میں ایم اے کیا اور پھر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی، اس کے بعد وہاں کے شعبۂ تاریخ میں لکچرر ہو گئے۔ اس سے ترقی کر کے ریڈر اور پھر شعبۂ اسلامیات میں پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد شعبہ کے صدر بھی ہوئے اور اسی عہدے پر رہتے ہوئے ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔

پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی بچپن سے بہت ذہین اور لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء اور علی گڑھ کے ماحول نے مطالعہ کا شوق مزید پیدا کر دیا، جس کی وجہ سے تاریخ اسلام، تاریخ ہند اور تاریخ عالم پر ان کی نظر گہری ہوتی گئی۔ خاص طور پر سیرت نبویؐ کو موضوعِ مطالعہ بنایا اور اس سلسلہ کے تمام عربی مصادر ومراجع پر دسترس حاصل کی۔

مقالات: انہوں نے سیرت پاک کے موضوع پر پچاسوں گراں قدر مقالات لکھے جو ملک اور بیرون ملک کے موقر جرائد ورسائل میں چھپے اور ان کی علمی تحقیقات کی داد دی گئی۔ ان کے مقالات خاص طور پر معارف اعظم گڑھ کے علاوہ تحقیقات اسلامی علی گڑھ میں شائع ہوتے تھے۔ وہ اردو، عربی اور انگریزی تینوں زبان میں مقالات لکھتے تھے۔

اپنے مقالات میں انہوں نے سیرت نبویؐ کے عام موضوعات کے علاوہ بہت سارے نئے

صدر رابطہ ادب اسلامی عالمی، بہار شاخ پٹنہ، نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ۔ موبائل: ۹۷۰۸۰۱۱۵۳۴۔

گوشے دریافت کیے اور ثابت کیا کہ تمام موضوعات بحث و نظر کے محتاج تھے۔ کیونکہ ایسے معلومات وافر مقدار میں موجود ہیں جو غور و فکر کے متقاضی ہیں۔ تحقیقات اسلامی میں شائع ہونے والے مندرجہ ذیل مقالات کے عنوانوں ہی سے ایک اندازہ ہوجاتا ہے، مثلاً:

۱۔ کیا مہاجرین مکہ خالی ہاتھ مدینہ آئے تھے (اپریل۔جون ۱۹۸۳ء) ۲۔ عہد نبوی میں مسلم معیشت (اکتوبر۔دسمبر ۱۹۸۳ء) ۳۔ معیشت نبوی مدینہ منورہ میں (اکتوبر ۱۹۸۹ء تا جنوری ۱۹۹۰ء) ۴۔ معیشت نبوی مکی عہد میں (جولائی۔ستمبر ۱۹۹۰ء) ۵۔ ازواج مطہرات کے مکانات: ایک تجزیاتی مطالعہ (جنوری۔مارچ ۱۹۹۱ء) ۶۔ اسفار غزوات نبوی میں ازواج مطہرات کی رفاقت (اکتوبر۔دسمبر ۱۹۹۵ء) ۷۔ عہد نبوی میں سماجی تحفظ کا نظام (اکتوبر۔دسمبر ۲۰۰۲ء)۔

معارف اعظم گڑھ میں تو کثرت سے ایسے مقالات شائع ہوئے، مندرجہ ذیل دو تین عنوانوں سے ان کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے:

۱۔ عہد نبوی میں رضاعت (معارف، جون۔جولائی ۱۹۹۶ء) ۲۔ بنو عبد مناف: عظیم تر متحدہ خاندان رسالت (فروری۔مارچ ۱۹۹۲ء) ۳۔ جاہلی عہد میں حنیفیت (اکتوبر ۲۰۰۳ء)۔

ان کے مقالات کے موضوعات اور مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت کے موضوع پر پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی کا مطالعہ کتنا وسیع، گہرا، پختہ اور ان کا ذہن کتنا بالغ النظر اور کشادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکثر سیرت کے نئے موضوعات پر لکھ کر قاری کے ذہن و فکر کو اپنی گراں معلومات سے نوازتے رہتے تھے۔ ان نئے موضوعات پر جگہ جگہ سے معلومات فراہم کرنا اور انہیں مرتب انداز میں قاری کے سامنے پیش کرنا کوئی آسان بات نہیں ہے۔ ان کی محنت اور علمی لگن اور ذوق کا کمال تھا کہ انھوں نے مشکل اور منتشر معلومات کو یکجا کر کے ہمارے سامنے آسان اسلوب میں پیش کیا۔ ایسے محنتی، باذوق اور دوررس نگاہ رکھنے والے اسلامی محقق ہمیں عام طور پر نظر نہیں آتے۔

محققانہ و ناقدانہ بحث و نظر: اس کے علاوہ ان کے مقالات میں تحقیقی اور تنقیدی شان و شوکت نظر آتی ہے۔ تاریخ اسلامی کے مصادر و مآخذ پر ان کی ناقدانہ و محققانہ نظر تھی نیز ہر کتاب کی کمزوریوں اور علمی لحاظ سے اس کی خامیوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں ایک طرف مصادر اسلامی سے استفادہ کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے تو دوسری طرف ان پر محققانہ انداز میں تنقید کرنے اور اس کی

کمزوریوں کو اجاگر کرنے کی بہترین صلاحیت رکھتے تھے۔

سادہ اسلوب بیان: انہوں نے اپنی نگارشات کے لئے کچھ نئے موضوعات کا انتخاب کیا لیکن اپنی نئی باتوں کو مشکل الفاظ اور دقت طلب اسلوب کے بجائے آسان اور سہل اسلوب بیان میں پیش کیا۔

تصنیفات: ان کی ۳۸ سے زائد کتابیں ہیں جو سیرت نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر لکھی گئی ہیں۔ بعض نئے موضوعات پر ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی مشکل پسندی، محنت ولگن، تلاش وتحقیق، نئی فکر اور نئی سوچ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

ان کی چند اہم کتابیں یہ ہیں:

۱۔ خلجی خاندان ۲۔ عہد نبوی کے ابتدائی مہمیں ۳۔ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت ۴۔ نبوی غزوات وسرایا کی اقتصادی اہمیت ۵۔ تاریخ تہذیب اسلامی ۶۔ عہد نبوی کا نظام حکومت ۷۔ اللہ اپنے کلام میں ۸۔ اندلس میں علم قرأت کا ارتقا ۹۔ تفسیر سورہ الحمد: عہد بہ عہد ۱۰۔ سورہ الحمد کی تفسیر ربانی ۱۱۔ توحید الٰہی اور مفسرین کرام ۱۲۔ غزوات نبوی کے اقتصادی جہات ۱۳۔ شاہ ولی اللہ کا فلسفہ سیرت ۱۴۔ بنو ہاشم اور بنو امیہ کے معاشرتی تعلقات۔

ان کی کچھ کتابیں عربی اور انگریزی زبان میں ہیں جو یہ ہیں:

۱۔ الھجمات المغرضۃ علی التاریخ الاسلامی ۲۔ الامام الشاہ ولی اللہ الدھلوی: عرض موجز لحیاتہ وفکرہ ۳۔ قضایا کتابۃ التاریخ الاسلامی وحلولھا۔

انگریزی:

1. Organisation of Government under the Prophet
2. Shah Waliullah Dehlavi: An Introduction to his illustrious Personalit and Achievements.
3. Catalogue of Arabic manuscripts in Aligarh Muslim University.
4. The Prophet Muhammadﷺ: A role model for Muslim Minorities.

مکی عہد نبویؐ میں اسلامی احکام کا ارتقا۔ ایک جائزہ: گرچہ ان کی بیشتر کتابیں قابل مطالعہ ہیں لیکن میں یہاں صرف ان کی اس کتاب کا ذکر کرتا ہوں جو ۲۰۰۸ء میں نشریات لاہور سے شائع ہوئی۔ یہ ایک ضخیم کتاب ہے جو ۷۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اسلامی احکام کے ارتقا کے سلسلے میں جن موضوعات سے بحث کی ہے اور جس تعمق اور گہرائی کے ساتھ ان کا مطالعہ

تفصیل سے پیش کیا ہے۔اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف سیرت کے مختلف پہلوؤں پر اچھی نظر رکھتے تھے بلکہ اسلامی علوم وفنون کے بحرزخار تھے۔

کتاب کے حرف آغاز میں انہوں نے مکی اور مدنی ادوار میں سیرتِ طیبہ کی دوگانہ تقسیم پر شاندار بحث کی ہے اور ابن خلدون وغیرہ کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ یہ تقسیم سیرت وشخصیت اور تاریخ کے تسلسل وارتقا کے لحاظ سے بے معنی ہوجاتی ہے۔کیونکہ ان کے فکر وفلسفہ کے مطابق تاریخی واقعات کا بہاؤ اوران کی تشکیل کا سلسلہ نہ زمان میں محدود ہوتا ہے اور نہ مکان میں۔

اس کے بعد انہوں نے مکی اسلام کی تفہیم پر مفصل بحث کی ہے اور اس سلسلے کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے طہارت،نماز،زکوٰۃ وصدقات،روزہ،حج وعمرہ،نکاح وطلاق،ولادت ورضاعت، احکام وفات وجنازہ،ماکولات ومشروبات،معاملات تجارت ومعیشت،احکام وجوب وسنت،احکام تحریم وکراہت،حدود وتعزیرات،آداب معاشرت اور مکی اسلام میں اصول احکام جیسے اہم اور گراں قدر مسائل پر عالمانہ گفتگو کی ہے اور قرآن وحدیث اور ائمہ کرام کے اقوال کی روشنی میں ان موضوعات کو علمی وتحقیقی لحاظ سے ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ذاتی تعلقات: پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی سے میرے تقریباً پچاس سال پرانے ذاتی تعلقات تھے۔وہ ۱۹۷۰ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں پی ایچ۔ڈی (تاریخ ہند) کررہے تھے تو میں اسی سال عربی میں ایم اے کرنے کی غرض سے علی گڑھ حاضر ہوا۔ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوگئے۔کیونکہ ہم دونوں آفتاب ہال میں رہتے تھے۔گھومنا پھرنا ساتھ ہوتا اور ہم دونوں ایک دوسرے کے گھریلو اور علمی موضوعات پر کھل کر باتیں کرتے تھے۔وہ بہت ہی نیک دل،صاف دماغ اور بے تکلف دوست تھے۔ان کی زندگی میں تکبر،گھمنڈ اور غرور نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔وہ ہمیشہ کشادہ پیشانی اور صفائی قلب سے ملتے۔ظرافت ان کی طبیعت میں شامل تھی۔اس لئے ہر بات میں مزاح کا پہلو نکال لیتے تھے۔ان کے مزاحیہ انداز گفتگو سے کوئی شخص کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ اعلیٰ پایہ کے محقق، مفکر اور مصنف ہیں۔ادھر پندرہ بیس سال کے عرصے میں علی گڑھ اور اعظم گڑھ کے کئی سمیناروں میں ان سے میری ملاقاتیں ہوئیں۔ان کے ملنے جلنے کا وہی بے تکلفانہ انداز تھا جو زمانہ طالب علمی میں ہوتا تھا۔خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔آمین۔

علامہ شبلی نعمانی کی سفرنامہ نگاری کے امتیازات

(سفرنامۂ روم ومصر وشام کے حوالے سے)

ڈاکٹر ناظرین فاطمہ

اردو سفرنامے کی روایت میں نمایاں نام ''علامہ شبلی نعمانی'' کا بھی ہے۔ انھوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں اسلامی ممالک کا سفر کیا۔ سفر سے واپسی کے بعد دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر حالات سفر قلم بند کیے۔ جس کا عنوان ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' ہے۔ یہ اردو کے نمایاں اور منفرد سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد ترکوں کے تمدنی حالات اور حسن معاشرت سے عوام کو آگاہ کرانا تھا۔ مولانا شبلی نعمانیؒ اپنے سفرنامے کی وجہ تصنیف سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

> ''رمضان المبارک ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۲ء میں میں نے قسطنطنیہ وغیرہ کا جو سفر کیا وہ محض ایک طالب العلمانہ سفر تھا اور چونکہ نہ یہ کوئی غیر معمولی امر تھا نہ واقعات سفر میں چنداں ندرت تھی۔ سفرنامہ لکھنے کا میرا ارادہ نہ تھا لیکن وہاں سے واپس آکر جن بزرگوں اور دوستوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ سب سفرنامے کے متقاضی تھے، میں نے خیال کیا کہ چونکہ ایک مدت سے ہماری جماعت میں سیر وسیاحت کا طریقہ بند ہے اور اس وجہ سے اسلامی ممالک کے صحیح حالات سے بالکل اطلاع حاصل نہیں ہوتی۔ لوگوں کا یہ تقاضا کچھ بے جا نہیں۔ مجھ کو خود اپنی حالت یاد آئی۔ کہ سفر سے پہلے قسطنطنیہ وغیرہ کا کوئی سیاح مل جاتا تو میں گھنٹوں وہاں کے حالات پوچھا کرتا''۔(۱)

شبلی نعمانی کا یہ سفر علمی نوعیت کا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا، سفرنامے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ کے مورخین مذہبی تعصب اور تنگ نظری کا شکار تھے

شعبۂ اردو علی گڑھ۔

اور اسلامی تاریخ کو انھوں نے اتنی شاطرانہ انداز میں پیش کیا تھا کہ مسلمان قوم سے متعلق غلط تصور اور نفرت انگیز تاثر قائم ہو گیا تھا، ان کی اس چالاکی سے شبلی نعمانی واقف ہو گئے تھے۔ اسی سلسلے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یورپ نے کسی زمانے میں مسلمانوں کے خلاف جو خیالات قائم کر لیے تھے۔ ایک مدت تک وہ علانیہ اس طریقے سے ظاہر کیے جاتے تھے کہ مذہبی تعصب کا رنگ صاف نظر آتا تھا۔ اور اس وقت قبول عام کا یہی بڑا عمدہ ذریعہ تھا۔ لیکن جب یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا اور مذہبی ترانے بالکل بے اثر ہو گئے۔ تو پالیسی نے دوسرا پہلو بدلا۔ اب یہ طریقہ چنداں مفید نہیں سمجھا جاتا کہ مسلمانوں کی نسبت صاف صاف متعصّبانہ الفاظ لکھے جائیں۔ بلکہ بجائے اس کے یہ دانش مندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں، اسلامی قوموں، اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرائے میں ظاہر کیے جاتے ہیں۔ اور عام تصنیفات، قصوں، ناولوں، ضرب المثلوں کے ذریعہ سے وہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہوجاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے جدا نہیں ہو سکتے''۔(۲)

مندرجہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ واضح ہوجاتا ہے کہ شبلی کا مقصد سفر غیر مسلم مورخین کی تنگ نظری اور غلط خیالات کی تردید کرنا تھا۔ اس کے لیے شبلی نعمانی نے دنیا کے سامنے مسلمانوں کا وہ رخ پیش کیا جسے یورپین تاریخ نویس نظر انداز کر دیتے تھے۔

شبلی نعمانی کے سفر اور سفرنامے کی وجہ تصنیف جاننے کے بعد سفرنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سفرنامے میں کون کون سی صفات موجود ہیں جس کی بنا پر اسے اچھے سفرنامے کے زمرے میں شامل کیا سکتا ہے۔ مثلاً سفرنامے کی ایک صفت یہ ہوتی ہے کہ سفرنامہ نگار قاری کو جس جگہ کی سیر کرا رہا ہے۔ قارئین کی نگاہوں کے سامنے وہ ساری چیزیں آجائیں جس سے سفرنامہ نگار کا سابقہ پڑا تھا یعنی اسے بیک وقت کیمرہ مین اور ادیب دونوں ہی کی خدمات انجام دینا ہوتا ہے۔ علامہ کے سفرنامے میں یہ صفت موجود ہے۔ مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے کتب فروشوں کی دکان کی سیر کرائی ہے:

”......کتب فروشوں کی دکانوں کی سیر کرو تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے۔ سنگ رخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتابیں جس قدر ہیں مجلد اور جلدیں بھی معمولی نہیں بلکہ عموماً مطلا و مذہب۔ مالک دوکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم سن خوش لباس لڑکے ادھر ادھر کام میں لگے ہیں۔ ہم نے دکان میں قدم رکھا ایک لڑکے نے کرسی لاکر سامنے رکھ دی اور کتابوں کی فہرست حوالہ کی۔ قیمت فہرست میں مذکور ہے اور اس میں کمی بیشی کا احتمال نہیں۔“(۳)

مذکورہ اقتباس میں انھوں نے دکان کی سیر کرائی ہے۔ دوکان دار کیسے بیٹھا ہے اس جانب بھی اشارہ کر دیا اور دو تین لڑکے گھوم رہے ہیں اور انھوں نے اچھے لباس زیب تن کر رکھا ہے۔ دوکان کے اندر داخل ہوتے ہی ان کو بیٹھنے کے لیے کرسی لاکر دی گئی اور ساتھ میں فہرست بھی۔ مولانا کے اقتباس سے دکان اور دکاندار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ خریدار کے ساتھ ان کا پیش آنے کا رویہ بھی معلوم ہوگیا۔ اور کوئی چیز ساکت نظر نہیں آئی، ہر انسان متحرک نظر آتا ہے۔

سفرنامے میں ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے وہ ہے مناظر و واقعات کا انتخاب۔ سفرنامہ نگار کو ایسے مناظر اور واقعات کو منتخب کرنا ہوتا ہے جس پر سفرنامے کے عمومی تاثر کا انحصار ہوتا ہے ساتھ میں انھیں پیش کرنے کا طریقہ بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ اس پورے مشغلے میں سفرنامہ نگار کو اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے مطابق یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ علامہ اس مرحلے کو بھی بحسن وخوبی انجام دیتے ہیں مثال کے طور پر ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے قسطنطنیہ کی عمارتوں کا ذکر اس طرح کیا ہے:

”یہاں کی عمارتیں ہندوستانی عمارتوں سے بالکل جداوضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ، چو منزلہ ہیں، صحن مطلق نہیں ہوتا، عمارتیں تمام لکڑی کی ہیں، بڑے بڑے امراء اور بادشاہوں کے محل بھی لکڑی کے ہی ہیں اور یہی سبب ہے کہ یہاں اکثر آگ لگتی ہے کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا کہ دو چار گھر آگ سے جل کر تباہ نہ ہوں اور کبھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لیے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے کہ کئی سو آدمی خالص اس کام پر مقرر ہیں۔ ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر دم موجود رہتے ہیں کہ جس وقت

کہیں آگ لگتی دیکھیں فوراً خبر کریں۔اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جابجا بنے ہوتے ہیں جس وقت آگ لگتی ہے فوراً توپیں سر ہوتی ہیں اور شہر کے حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ان کو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا ان کی جھپٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف دہ ہوتی ہیں اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے۔"(۴)

مندرجہ بالا اقتباس میں علامہ نے قسطنطنیہ کی عمارتوں سے متعلق واقعے کو منتخب کیا ہے۔ واقعے میں دلچسپی اور تحیر کے عناصر بھی شامل ہیں۔اس سفرنامے میں جو تاثر قاری پر اس وقت قائم ہوا تھا وہ موجودہ دور میں بھی قائم ہوتا ہے۔اس لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا واقعے کے انتخاب میں اور اسے پیش کرنے کے انداز پر قدرت رکھتے ہیں۔

سفرنامہ نگاری چونکہ ایک بیانیہ صنف ہے۔اس بیانیہ کو تاثیر اور مقبولیت بخشنے کے لیے ایسا اسلوب اختیار کرنا ہوتا ہے جو داخلی طور پر توانائی اور سچائی کا ضامن ہو اور شگفتہ ہونے کے باوجود سفرنامے کی سنجیدگی اور متانت کو مجروح نہ کرے۔علامہ شبلی کے سفرنامے میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں، بہ طور مثال ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے ترکوں کے کتب خانوں کی ظاہر حالت کو بیان کیا ہے:

"یہ کتب خانے خوبی عمارت اور دیگر سروسامان کے لحاظ سے معمولی درجے کے ہیں، یہاں تک کہ بعض کتب خانوں میں الماریاں تک نہیں، ایک چبوترہ پر جس کے گرد لوہے کا کٹرہ ہے کتابوں کا ڈھیر لگا دیا ہے، تمام کتب خانوں میں زمین کا فرش ہے، البتہ اس قدر تکلف ہے کہ سامنے بنچیں بچھی ہوئی ہیں۔جن پر کتابیں رکھ کر پڑھتے ہیں، کتب خانہ حمیدیہ جو حال میں قائم ہوا ہے اور سلطان المعظم کے عہد مبارک کی یادگار ہے، اگرچہ زیادہ شان وشوکت ہے، عمارت خوبصورت اور وسیع ہے، میز کرسیاں، کوچیں جس قدر ہیں، ان پر ریشمی گدے ہیں، غرض تمام باتوں میں اور کتب خانوں

سے مستثنیٰ ہے، تاہم الہ آباد کی پبلک لائبریری کی برابری نہیں کرسکتا۔"(۵)

یہاں علامہ شبلی نے ترکوں کی لائبریریوں کی صورت حال کا جائزہ لیا ہے اور اس کے بیان میں موثر انداز اور پرلطف اسلوب اختیار کیا ہے۔ سچائی سے وہاں کا پورا نقشہ بیان کردیا ہے۔ جس سے ان کے سفرنامے میں سنجیدگی اور متانت برقرار ہے۔

سفرنامے کی ایک اہم خصوصیت اس کا ادبی حسن ہے۔ سفرنامہ نگار جو کچھ بھی رقم کرتا ہے اس میں ادبیت ہونا چاہیے۔ اگر اس کا سفرنامہ ادبی حسن سے عاری ہے تو اس کی حیثیت محض سفری بیان سے زیادہ نہ ہوگی۔ قاری کی دلچسپی برقرار رکھنے کے لیے ادبی چاشنی سفرنامے کا جزو اعظم ہے۔ علامہ شبلی سفرنامے کی اس خوبی سے واقف ہیں اور اپنی تحریروں میں ادبی حسن کو شروع سے آخر تک برقرار رکھنے کی کامیاب کوشش بھی کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک اقتباس ملاحظہ ہو جہاں انھوں نے ترکوں کے فن ادب سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں۔ لکھتے ہیں:

"فن ادب میں میں نے اس قسم کی کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی بلکہ خیال تک نہ تھا کہ ایسی کوئی کتاب مسلمانوں نے کبھی لکھی ہوگی جس میں مضامین شعری کی تاریخ ہو یعنی فلاں مضمون، اول فلاں شاعر نے لکھا پھر رفتہ رفتہ فلاں فلاں شاعر نے یہ یہ اضافہ کیا یا اس طرح کی صورتیں بدلیں۔ عاشر آفندی کے کتب خانے میں میں نے ایک بڑی ضخیم کتاب خاص اس موضوع پر دیکھی۔ مصنف نے دعویٰ کیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین عرب جاہلیت نے ایجاد کیے۔ پھر متاخرین نے ان کو ترقی دی اور نئے نئے پیرائے نکالے۔ تمام کتاب اسی دعویٰ کے ثبوت میں ہے مصنف ہر مضمون کے لیے عرب جاہلیت کا ایک شعر نقل کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسلامی شعرا میں سے فلاں شاعر نے اسی مضمون کو ذرا بدل کر اس طرح لکھا پھر دولت بنوامیہ اور عباسیہ شعرا نے اسی سے اور اور صورتیں پیدا کیں۔ اس کتاب کو پڑھ کر مصنف کی وسعت نظر اور دقیقہ سنجی پر حیرت ہوتی ہے اور ساتھ ہی افسوس ہوتا ہے کہ متاخرین اس قسم کی نادر تصنیف کی پیروی نہ کرسکے۔"(۶)

مذکورہ اقتباس میں علامہ شبلی نے ترکوں کے پاس موجود ذخیرۂ ادب اور تاریخ کی نایاب

تصنیفات ہونے کے باوجود اس سے فیض نہ اٹھانے پر اظہار افسوس کیا ہے۔ان کی تحریروں میں ادبی حسن بھی برقرار ہے اور دلچسپی کے عناصر بھی شامل ہیں۔

سفرنامے میں اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ سفرنامہ نگار ساکن وجامد اشیا کی جگہ ان لطیف کیفیات پر زیادہ توجہ مرکوز رکھے جنھوں نے اس کی بصری قوتوں کو متاثر کیا ہے۔علامہ اس مرحلے سے بھی بحسن وخوبی گزرتے ہیں۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

> ”طالب علموں کی تفریح کے لیے ایک خوبصورت حوض بنا ہے جن میں مختلف رنگ کی مچھلیاں پڑی ہیں اور جا بجا بنچیں اور کرسیاں بچھی ہیں۔ پروفیسروں اور ٹیچروں کے لیے ذرا فاصلے پر الگ حوض ہے۔ چونکہ چلتے چلتے تھک گئے تھے ہم نے وہاں دم لیا اور دیر تک صحبت رہی جب آفندی جوترکی زبان کی انشا سکھانے پر مامور ہیں اور فارسی زبان جانتے ہیں آخری دورے میں ہمارے ساتھ ہو لیے تھے۔ان کے ذریعے سے کالج کے معزز افسروں سے بے تکلف بات چیت ہوسکتی تھی۔ پروفیسر اور طالب علموں نے مجھ سے جس اخلاقی اور اسلامی محبت کا برتاؤ کیا میں اس کی کیفیت بیان نہیں کرسکتا۔“(۷)

اس اقتباس میں علامہ شبلی مکتب حربیہ جب گھومنے گئے تو وہاں کے طالب علموں اور اساتذہ کے خوش اخلاقی اور محبت سے پیش آنے کے واقعات کو قلم بند کیا ہے۔اوران احساسات وکیفیات کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جوملاقات کے دوران ان پر طاری ہوئے اور دیر پا رہے۔

سفرنامہ نگار کسی نئے ملک سے جب گزرتا ہے تو وہاں کے رسم ورواج دیکھ کر فطرتاً اپنے ملک کے رسم ورواج سے موازنہ کرتا ہے۔اس موازنے کے دوران اگر اسے اپنے معاشرے میں زیادہ خوبیاں نظر آتی ہیں تو اس کے اندر جذبۂ تفاخر کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہوتا ہے تو احساس کمتری اور احساس ندامت کا شکار ہوجاتا ہے۔علامہ شبلی جب قسطنطنیہ کے مختلف مقامات سے گزرتے ہیں اسی جذبے سے دوچار ہوتے ہیں اور اس کی مثالیں ان کے سفرنامے میں اکثر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ”افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔وہ جانتے ہی نہیں کہ اس

قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لیے کس قدر ضروری ہیں۔اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے،دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی ہیں۔جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں لیکن اس طریقے میں دو بڑے نقص ہیں، اولاً تفریح کے جلسے پر فضا مقامات پر ہونے چاہئیں کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کو فائدہ پہنچے۔دوسرے سخت خرابی یہ ہے کہ چونکہ یہ جلسے پرٖیوٹ (پرائیویٹ) جلسے ہوتے ہیں اس لیے ان میں غیبت،شکایت اور اس قسم کی لغویات کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا،بہ خلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمع عام کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔قسطنطنیہ اور مصر میں میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا لیکن میں نے کبھی اس قسم کے تذکرے نہیں سنے۔تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا اور نہ ہوسکتا تھا۔‘‘(۸)

محولہ بالا اقتباس میں علامہ شبلی قہوہ خانوں میں ہونے والی محفلوں اور وہاں کی گفتگو سے متاثر نظر آتے ہیں اور ہندوستان میں منعقد ہونے والی محفلوں پر اور ان کے درمیان کی جانے والی بحث ومباحث کے موضوع جس میں غیبت کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ان دونوں کے موازنے کے ذریعے احساس ندامت اور افسوس کا اظہار کیا ہے۔موازنے کا ایک مثبت پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے ان خرابیوں اور عیبوں کی نشان دہی ہوجاتی ہے جو منفی اثرات لیے ہوئے ہوتی ہیں۔جب اس کی پہچان ہوجائے تو اس سے نجات پانے کا وسیلہ بھی بآسانی تلاش کرلیا جاتا ہے۔جس کی مثال علامہ شبلی کے یہاں دیکھنے کو مل جاتی ہے۔

سفرنامے کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ ایسی کتابیں غیر جانب داری اور احتیاط کا مطالبہ کرتی ہیں۔سفرنامہ نگاروں کو سفرنامے کی تخلیق کرتے وقت تاریخ،تہذیب وتمدن،سیاست،معاشرت، جغرافیہ غرض ہر جگہ دیانت داری اور احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔علامہ شبلی اپنے سفرنامے میں پوری طرح محتاط نظر آتے ہیں اور جابجا دیانت داری کا ثبوت دیا ہے۔بہ طور مثال ایک اقتباس ملاحظہ ہو جس میں انھوں نے قسطنطنیہ کے کالجوں کے ترقی یافتہ نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

’’اس سے بڑھ کر یہ افسوس ہے کہ قسطنطنیہ کے تمام کالج اور دارالعلوم جن کا میں نے ذکر کیا حکومت کی طرف سے ہیں۔قوم نے ابھی تک اس طرف کچھ توجہ

نہیں کی ہے یعنی اتنے بڑے دارالسلطنت میں ایک بھی قومی کالج نہیں۔کوئی گورنمنٹ گو کتنی ہی مقتدر اور دولت مند ہو لیکن تمام ملک کی علمی ضرورتوں کی کفیل نہیں ہوسکتی، اگر ہو بھی تو چنداں مفید نہیں جس قوم کی تمام ضرورتیں گورنمنٹ انجام دیا کرتی ہے اس کی دماغی اور روحانی قوتیں مردہ اور بیکار ہوجاتی ہیں۔ یورپ میں جو عظیم الشان علمی کارخانے پھیلے ہوئے ہیں ان میں زیادہ تر قوم کا حصہ ہے۔"(۹)

درج بالا اقتباس میں علامہ شبلی نے ترکوں کے تعلیمی نظام کو ترقی یافتہ نہ ہونے پر اظہار افسوس کیا ہے اور اس کی وجہ کو بھی ظاہر کردیا ہے کیونکہ کالج کے اخراجات کے لیے یہ پوری طرح حکومت پر منحصر ہے۔

بہ طور مجموعی اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کا سفرنامہ "سفرنامۂ روم ومصروشام" فنی اعتبار سے پختہ اور جامع ہے۔اسے پڑھ کر اگر کوئی شخص اس عہد کے روم ومصروشام میں قدم رکھتا تو ہر چیز مانوس سی نظر آتی۔ اس سفرنامے میں معلومات کا ذخیرہ ہے جو نہایت خوبی کے ساتھ قاری کی یادداشت میں منتقل ہوجاتا ہے۔قسطنطنیہ میں مکتبے اور کالج،وہاں کے درس وتدریس کا طریقہ،خوش اسلوبی،صفائی،نظم وضبط کا مظاہرہ کرتے ہیں۔شبلی ترکوں کی معاشرت سے متاثر نظر آتے ہیں ان کی سادگی اورڈسپلن کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کرتے ہیں ۔کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ باتیں اس خوبی سے کہہ دیتے ہیں کہ قاری محسوس کرتا ہے کہ سارا منظر خود اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ سفرنامے میں ان کی زبان سادہ، سلیس اور سنجیدہ ومتین ہے انداز بیان شگفتہ ہے وہ خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں تو خامیوں کو بھی بے باکی سے بیان کرتے ہیں اور اظہار افسوس بھی۔

حواشی

(۱) سفرنامۂ روم ومصروشام، علامہ شبلی نعمانی، ص۶، قومی پریس، دہلی، سنہ اشاعت ۱۳۱۹ھ۔ (۲) ایضاً، ص ۷۔ (۳) ایضاً، ص ۴۱۔ (۴) ایضاً، ص ۴۲۔ (۵) ایضاً، ص ۷۷۔ (۶) ایضاً، ص ۸۰۔ (۷) ایضاً، ص ۵۹-۶۰۔ (۸) ایضاً، ص ۴۱-۴۰۔ (۹) ایضاً، ص ۵۵۔

دور حاضر میں بہار کی اردو تنقید اور چند تنقید نگار

ایک مختصر جائزہ

ڈاکٹر ماجدہ امجدی

بہار میں اردو ادب کی تاریخ کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہاں اردو ادب کی روایت شروع ہی سے بڑی مستحکم رہی ہے۔ بہار کے ادیبوں اور نقادوں نے شعر و نثر دونوں میں ہمیشہ ایمانداری اور مستعدی سے اردو ادب کی مختلف صنفوں کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے، ملکی سیاست کا اتار چڑھاؤ، سماجی عدم مساوات اور فرقہ وارانہ منافرت جس طرح ملک کے دیگر حصوں میں کارفرما ہے، بہار اس سے مستثنیٰ نہیں ہے بالخصوص آزادی سے کچھ قبل اور کچھ بعد کا حصہ پورے ملک کے لیے بہت ہی پرآشوب دور رہا ہے یعنی ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۶۰ء تک کا زمانہ بہت ہی کشمکش کا زمانہ کہا جاسکتا ہے۔

اردو تنقید بھی دیگر اصناف ادب کی طرح زمانے کے نشیب و فراز سے گو متاثر ہوئی لیکن تنقید کا ارتقا رکا نہیں، ریاست بہار میں اردو ادیبوں اور نقادوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جو اردو زبان و ادب کے لیے ایک خوش آئند حقیقت ہے۔

یہاں عصر حاضر کے چند قابل ذکر تنقید نگاروں میں چند کا نہایت اختصار سے ذکر کیا جاتا ہے، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر لطف الرحمن، احمد سجاد، شکیل الرحمن، پروفیسر نجم الہدیٰ اور پروفیسر قمر اعظمی ہاشمی۔

عبدالمغنی: پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے انگریزی میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کیا، اردو کے مشہور و معروف نقاد کلیم الدین احمد کے شاگرد تھے اور بی۔این کالج پٹنہ یونیورسٹی میں ہی انگریزی کے

رامپور کونڈ، کیسریا، مشرقی چمپارن (بہار)۔

پروفیسر کی حیثیت سے درس و تدریس سے منسلک رہے، زمانہ طالب علمی سے ہی ان کے تنقیدی مضامین ریاست کے اخبارات اور ملک کے مقتدر رسالوں میں وقفے وقفے سے شائع ہوتے رہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں، ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ ''نقطہ نظر'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا اور دوسرے مجموعے کا نام ''جادۂ اعتدال'' ہے جو ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آیا، تیسرا مجموعہ ''تشکیل جدید'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، چوتھا ''اقبال اور عالمی ادب'' کے نام سے منظر عام پر آکر قارئین سے خراج عقیدت حاصل کر چکا ہے۔

ان کی تنقیدی تحریروں کے مطالعے سے اس بات کا پتہ ملتا ہے کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ان کی فکر میں گہرائی ہے۔ ان کی تنقیدی نگارشات میں مشرقیت کا رنگ غالب ہے۔ ان کا ادبی نقطہ نظر اعتدال پسند اور مذہبی اسلامی اور تعمیری رہا ہے۔

پروفیسر عبدالمغنی صاحب نے اپنے اخلاقی اور روحانی نظریہ تنقید کے پیش نظر اردو ادب کے فن پاروں کا مطالعہ کیا ہے۔ غالب ہوں یا اقبال، جوش ہوں یا مجاز، آل احمد سرور ہوں یا احتشام حسین، کلیم الدین احمد ہوں یا دوسرے نقاد، انیس و دبیر کی شاعری ہو یا ادبی فن پارے کی دیگر اصناف، سبھوں میں عبدالمغنی صاحب نے آفاقی اور ادبی قدروں کو تلاش کرنے کی بڑی حسین کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمٰن: ڈاکٹر شکیل الرحمن کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ایام طالب علمی سے ہو چکا تھا، ۵۳-۱۹۵۲ء میں جب وہ ایم اے۔ اردو پٹنہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے تو ان کی کتاب ''ادب اور نفسیات'' زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی تھی۔ ان کی مشہور و معروف تنقیدی کتاب ''غالب کی جمالیات'' کے مطالعے سے، ان کے تنقیدی رجحانات کی بھرپور جھلک سامنے آتی ہے۔ ان کی دوسری کتاب ''زبان اور کلچر'' کے نام سے لسانیات کے موضوع پر ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی۔

شکیل الرحمٰن نے کسی تحریک یا ''ازم'' (Ism) سے متاثر ہونے کی بجائے اپنی راہ خود نکالی ہے، ان کی قابل لحاظ کتاب ''قرآن کی جمالیات'' بھی ہے، وہ نہ ترقی پسند ہیں نہ جدیدیت کے علم بردار، ان کا نقطہ نظر خالص معروضی، تجزیاتی، ادبی اور جمالیاتی ہے، وہ مذہبی اقدار کا احترام بھی کرتے ہیں۔

وہاب اشرفی: عہد حاضر کے نقادوں میں وہاب اشرفی کا نام نہایت ہی قابل احترام ہے۔ تنقیدی دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے وہ بحیثیت افسانہ نگار شہرت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی پہلی

تنقیدی کاوش ''قطب مشتری'' ایک تنقیدی جائزہ کے پیش لفظ میں پروفیسر اختر قادری نے تحریر کیا ہے:

''وہاب اشرفی ایم اے جواں سال اور کم عمر ہونے کے باوجود اپنی ادبی دلچسپیوں اور بالخصوص اپنے اردو افسانوں کی بدولت اردو کے ادبی حلقوں میں متعارف ہو چکے ہیں''۔(بحوالہ قطب مشتری ایک جائزہ، ص ۲۴)

ڈاکٹر وہاب اشرفی کی درج ذیل کتابوں کے مطالعے سے ان کے تنقیدی موقف کو بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ ''قطب مشتری ایک تنقیدی جائزہ''، ''قدیم ادبی تنقید''، ''شاد عظیم آبادی اور ان کی نثر نگاری''، ''معنی کی تلاش''، ''مثنویات میر کا تنقیدی جائزہ''، ''نئی قدریں''۔

اس کے علاوہ بھی ان کی تنقیدی اور ادبی نگارشات ہیں جن سے ان کے مطمح نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

پروفیسر نجم الہدیٰ: پروفیسر نجم الہدیٰ صاحب کا آبائی وطن شمالی بہار کا مشہور و معروف شہر موتیہاری ہے، میٹرک اور آئی۔ اے بھاگلپور سے کیا، پھر بی اے اردو آنرز میں ایل۔ ایس کالج مظفر پور سے امتیازی نمبرات سے کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۸ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے اردو کا امتحان فرسٹ کلاس سے پاس کیا۔ عملی زندگی کا آغاز ۱۹۶۱ء سے ملت کالج دربھنگہ کے شعبۂ اردو و فارسی سے کیا، پھر ۱۹۶۲ء میں کمیشن کے ذریعہ ایل ایس کالج مظفر پور کے شعبہ اردو و فارسی میں بحیثیت لکچرار تقرری ہوئی، اس طرح ایک عرصۂ دراز تک اس مشہور دانش گاہ سے وابستہ رہ کر درس و تدریس کی خدمات انجام دیتے رہے۔ درمیانی مدت میں مدراس یونیورسٹی کے شعبہ عربی و فارسی و اردو کے سربراہ اور پروفیسر کی حیثیت سے تقریباً بارہ سال گزار کر پھر وطن مالوف بہار آئے اور یہیں سے سبک دوش ہوئے۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ کا شمار بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ابھرنے والے ناقدین میں ہوتا ہے۔ تحقیق و تنقید دونوں میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور دونوں کو اپنے محبوب موضوعات کے طور پر اختیار کیا۔ ان موضوعات پر ان کے مضامین ملک کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے۔

ان کی سب سے پہلی تنقیدی کتاب ''فن تنقید اور تنقیدی مضامین'' ۱۹۶۶ء میں منظر عام پر آئی جس کا علمی اور ادبی حلقوں میں پرجوش خیر مقدم ہوا۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی تنقیدی نگارشات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے

کہ ان کا تنقیدی رجحان، تقابلی اور تجزیاتی تنقید سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ انہوں نے مغربی ناقدین کا بھرپور مطالعہ کرنے کے بعد فن تنقید کی اہمیت وافادیت سے اپنی اس کتاب میں بحث کی اور تنقید کے مختلف دبستانوں کو بھی وہ زیر بحث لائے ہیں ساتھ ہی اردو میں تنقید جدید کے ارتقائی سفر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح یہ کتاب بڑی باوقعت اور گراں مایہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس کتاب کی تصنیف پر چالیس سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن آج بھی اس کی اہمیت باقی ہے۔ یہ کتاب مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں شامل ہے۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی کتابیں ''مثنوی کا فن اور اردو مثنویاں'' اور ''کردار اور کردار نگاری'' بھی ہیں، یہ دونوں اپنے موضوع پر بڑی اہم تصانیف کہی جاسکتی ہیں، مثنوی کے فن پر کوئی بھی کام کرنے والا اس کتاب کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ مثنوی کے فن پر دیگر ادیبوں اور ناقدوں نے بھی اظہار خیال کیا ہے مگر جو تفصیل اور سیر حاصل بحث اس کتاب میں ملتی ہے اس سے کتاب کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

''کردار اور کردار نگاری'' اپنے موضوع پر اردو کی پہلی کتاب ہے۔ شعری اور نثری بالخصوص ناول اور افسانہ کی کردار نگاری کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر نجم الہدیٰ کی ایک اور کتاب ''مسائل ومباحث'' ہے، یہ ان کی مختلف تحقیقی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوچکے تھے۔ اس کتاب کا سب سے اہم مضمون غالب پر ہے۔ انہوں نے غالب کی عظمت کو جس طرح ثابت کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہوسکتا ہے۔ ''تصوف اور کلام قربی'' بھی ان کا ایک تحقیقی کارنامہ ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ انہوں نے بے شمار مقدمات اور تبصرے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ وہ غیر معمولی تنقیدی بصیرت کے حامل ہیں اور اردو تنقیدی تاریخ جب بھی مرتب کی جائے گی تو ان کا نام یقیناً شامل رہے گا۔ ڈاکٹر ثریا جہاں نے پروفیسر نجم الہدیٰ پر تحقیقی کام کرکے نہ صرف پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے بلکہ اپنا تحقیقی کام کتابی شکل میں دوبارہ ترمیم و اضافہ کے ساتھ دو ناموں سے وقفے وقفے سے چھپوایا ہے۔ پہلے کراچی پاکستان سے پھر بہار اردو اکیڈمی کے تعاون سے ہندوستان میں۔

اخبار علمیہ

''زبان سیکھنے کے عمل کی ابتدا''

بچوں کے دماغ پر تحقیق کرنے والے نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی سے وابستہ محققین کو حال ہی میں پتہ چلا ہے کہ بچے بولنے کی عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی لفظوں کو پہچاننا اور انہیں مختلف چیزوں سے منسلک کرنا شروع کردیتے ہیں۔ ساڑھے چار ماہ کی عمر کو پہنچنے تک اگرچہ بولنا شروع نہیں کرتے لیکن ماں انہیں جو کچھ کہتی ہے وہ اس پر اپنا ردعمل ظاہر کرسکتے ہیں۔ اس دوران والدین کا سب سے بہتر عمل یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ بولیں۔ ماہرین کے مطابق بچوں میں زبان سے متعلق شعور اسی وقت سے پیدا ہونا شروع ہوجاتا ہے جب وہ شکم مادر میں ہوتے ہیں۔ آغوش مادر میں پرورش کے دوران ماں کی آواز بھی بچہ سن رہا ہوتا ہے۔ ٹمپل یونیورسٹی، فلاڈیلفیا میں چھوٹے بچوں کی زبان سے متعلق سربراہ کیتھی ہیرش پاسک کہتی ہیں کہ بچوں پر گیت کے اثرات زیادہ پڑتے ہیں اور جو الفاظ یا بول انہوں نے ماں کے پیٹ میں سنے ہوتے ہیں ان میں سے انہیں کچھ اس وقت یاد آنے لگتے ہیں جب وہ زبان کی کلاس میں پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ بولنے سے پہلے لفظوں کو سمجھنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ نوزائیدہ کے کان میں جب کوئی لفظ پڑتا ہے تو وہ اس کے دماغ میں کوڈ کی شکل میں محفوظ ہوجاتا ہے، پھر دماغ کئی تجربات سے گزرنے کے بعد اس کوڈ کا ارد گرد کی چیزوں کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور اس کے بعد بولنے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ ۱۱-۱۲ ماہ کی عمر سے بچے سادہ سادہ لفظ بولنے لگتے ہیں، تاہم تین سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ مکمل جملے بولنے اور اپنا مطلب بیان کرنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ جو بچے بچپن میں زیادہ بولتے ہیں ان کا آئی کیو اسکور زیادہ ہوتا ہے اور اسکول میں ان کا نمبر بھی زیادہ آتا ہے۔ (منصف حیدرآباد، ۲۲ ستمبر ۲۰ء، ص ۳، سائنس و ٹکنالوجی)

''باریک ترین شمسی سیل''

اب شمسی سیل کو اتنا باریک اور ہلکا بنانا ممکن ہوگیا ہے کہ وہ ایک بلبلے کے اوپر ٹھہر سکتے ہیں۔ شاہ عبداللہ یونیورسٹی برائے سائنس و ٹکنالوجی کے شعبۂ فزکس و انجینئرنگ کے ماہرین نے انتہائی باریک شمسی سیل انک جیٹ ٹکنالوجی سے تیار کیے ہیں۔ ان کے بدولت بہت چھوٹے روبوٹ، ڈرون، حساس سینسر، جسم پر چپکنے والے بایو سنسر اور دیگر آلات کو توانائی فراہم کرنا آسان ہوجائے گا۔ اس سے

روبوٹ کی الکٹرانک جلد بھی تیار کی جاسکے گی اور جگہ گھیرنے والی بھاری بیٹریوں کی ضرورت ختم ہوجائے گی، کیونکہ اس ایجاد سے کمرے کے اندر اور باہر دونوں جگہ بجلی بنائی جاسکے گی۔اس سے پہلے باریک ترین شمسی سیل دو طریقوں سے بنائے جاتے رہے ہیں جس میں اسپین کوٹنگ اور تھرمل ایوایوریشن ٹکنالوجی میں مشہور ہیں لیکن ان طریقوں سے بنے شمسی سیل سخت، نہ لچکنے والے اور مخصوص شکل میں ہی ڈھالے جاسکتے ہیں۔اس لیے ماہرین نے انک جیٹ ٹکنالوجی کے ذریعہ ایک کے بعد ایک تہ چڑھائی اور اس کے نتیجہ میں انقلابی شمسی سیل تیار کیا گیا۔اس کے لیے صفاف اور موصل (کنڈکٹر) پالیمر استعمال کیا گیا، جسے پولی ایسٹرن سلفونیٹ کہا جاتا ہے۔اس میں الیکٹرون کی پرتوں کے درمیان روشنی جذب کرنے والا فوٹو وولٹائک میٹریل ایک سینڈوچ کی طرح رکھا جاتا ہے۔اس کے بعد پورے شمسی سیل کو محفوظ کرنے کے لیے اس پر ایک اور واٹر پروف میٹریل چڑھایا گیا ہے جسے پیرائلین کہا جاتا ہے لیکن ابھی اس عمل کے لیے روشنائی تیار کرنا بہت بڑا مسئلہ تھا اور مطلوبہ جسامت کے قطروں کا حصول تقریباً محال تھا لیکن اس کامیابی کے بعد شیشے پر شمسی سیل بنایا گیا۔اس طرح اس کی افادیت ۴ء۴۳ فیصد ہوگئی جو ابتدائی درجے میں ایک بہت اچھی کاوش ہے۔(تاثیر پٹنہ، ۳ ستمبر ۲۰ء، ص ۷)

"کرونا سے صحت یاب مریضوں پر مضر اثرات"

دنیا بھر میں کرونا سے ہونے والی دس لاکھ سے متجاوز اموات کے بعد جنوبی کوریا میں کی گئی تحقیق میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ کرونا سے دس صحت یاب مریضوں میں ۹ مریض ایسے ہیں جن کو مستقل مسائل صحت کا سامنا ہے۔یعنی یہ مریض قوت شامہ سے محروم، ذہنی تناؤ اور دیگر عوارض کا شکار ہونے لگے ہیں۔رپورٹ کے مطابق کرونا سے مکمل صحت یاب ۹۶۵ مریضوں میں ۸۷۹ افراد کو ایسا عارضہ لاحق ہوا ہے جو ان کے لیے مسلسل پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش میں ہیں۔انہیں ذہنی کام کاج میں دشواریوں کا سامنا ہے۔اس کی بنیادی وجہ دورانِ علاج ان کے ساتھ کیا جانے والے غیر ہمدردانہ سلوک اور ان کو تنہا کیے جانے والا قدم بتائی جارہی ہے۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لیے ماہرین کا کہنا ہے کہ کرونا سے صحت یاب ہونے کے بعد ان کی صحت کی مکمل جانچ بالخصوص سونگھنے کی صلاحیت اور دوسرے عوارض کا جائزہ لے کر فوری علاج شروع کیا جائے، بہتر اور معیاری دواؤں کے ذریعہ ان کے علاج کو یقینی بنائے جانے کی ضرورت ہے۔جنوبی کوریا کی اس رپورٹ کے بعد دنیا کے متعدد ممالک میں کرونا سے صحت یاب مریضوں پر تحقیق کا عمل شروع کیا

جا چکا ہے لیکن بعض زیادہ متاثر ممالک امریکہ وغیرہ میں ابھی اس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی ہے۔
(سیاست، حیدر آباد، ص ۵، ۱۱/اکتوبر ۲۰ء)

''خواب بھولنے کی وجہ پر تحقیق''

آسٹریلیا کی ایک یونیورسٹی کے ماہرین نے بیدار ہوتے ہی خواب بھول جانے کی وجہ جاننے کے لیے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ جاگنے کے ۵ منٹ کے بعد انسان خواب کا بیشتر حصہ بھول جاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق انسانی دماغ کے متعدد حصے ہیں جو بیک وقت نیند میں نہیں جاتے۔ ان میں کچھ سوتے اور بقیہ جاگتے رہتے ہیں۔ دماغ کا ایک حصہ محدود اور دوسرا مستقل یادداشت کے لیے خاص کیا گیا ہے۔ اسی طرح محدود سے مستقل یادداشت تک معلومات منتقل کرنے کا بھی ایک حصہ ہے، جو سب سے آخر میں سوتا ہے مگر سب سے پہلے جاگتا ہے۔ جب کوئی خواب دیکھتا ہے تو یہ محدود یادداشت میں محفوظ ہو جاتا ہے مگر جب اسے مستقل یادداشت والے حصہ میں منتقل ہونے والی باری آتی ہے تو معلومات منتقل کرنے والا حصہ سو جاتا ہے جس کے سبب خواب یاد نہیں رہتا۔ جن لوگوں کو خواب کی تفصیل یاد رہتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خواب دیکھنے کے بعد معلومات منتقل کرنے والا حصہ اچانک جاگ اٹھتا ہے اور پھر یہ تمام باتیں مستقل یادداشت والے حصہ میں منتقل ہو جاتی ہیں۔
(اعتماد، حیدر آباد، ۱۰/اکتوبر ۲۰ء)

''جارج ولیم کا قبول اسلام''

مشہور یوٹیوبر جے یلغزی کا تعلق برطانیہ سے ہے۔ رپورٹ کے مطابق دو مہینہ قبل انہوں نے ترکی کی سلیمانیہ مسجد کے دورہ کے بعد قبول اسلام کا حتمی فیصلہ کیا۔ ''میں مسلمان ہو گیا'' کے عنوان سے ان کے کلمہ پڑھنے کی ویڈیو خوب نشر و شیئر کی جا رہی ہے۔ انہوں نے اپنے پیغام میں کہا کہ اسلام کو سمجھنے کے بعد احساس ہوا کہ اسلام ہی واحد راستہ ہے جس کی مجھے برسوں سے تلاش تھی۔ اسلام سب سے خوبصورت اور پر امن دین ہے۔ میرا تعلق غیر مسلم اکثریت والے ملک سے ہے۔ اسی وجہ سے یہاں لوگ اسلام کو سمجھنے میں غلطی کر بیٹھتے ہیں لیکن حقیقت میں یہ دین حق و صداقت اور امن و امان کا درس دیتا ہے۔ (صحافی دکن، حیدر آباد، ۴/ستمبر ۲۰ء، ص ۴)

(ک۔ص۔اصلاحی)

معارف کی ڈاک

مکتوب علی گڑھ

(ایک شعر کی تحقیق)

۱۴۴۲/۲/۴ھ

۲۰۲۰/۹/۲۲ء

برادر محترم زیدت معالیکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کل شام کو معارف کا اپریل ۲۰۲۰ء کا شمارہ باصرہ نواز ہوا، ورق گردانی کرتے ہوئے ایک شعر پر نظر پڑی:

وان احسن بیت أنت قائله

بیت یقال إذا انشدته صدقا

اس کو مقدمہ حالی کے حوالے سے بنقل از عقد الفرید زہیر بن ابی سلمیٰ کا بتایا گیا ہے، (معارف ص ۲۸۵-۲۸۴) میرے سامنے اس وقت دیوان حسانؓ (دار صادر، بیروت ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء) کھلا ہوا ہے، اس کے ص ۱۶۹ پر حضرت حسانؓ کا شعر اس طرح چھپا ہے:

وان أشعر بیت أنت قائله

بیت یقال إذا نشدته صدقا

دیوان حسان کی سب سے مقبول و معروف شرح عبدالرحمٰن البرقوقی کی ہے، البرقوقیؒ کا طریقہ یہ ہے کہ دیوان حسان میں کسی جگہ اس طرح کا کوئی مصرع یا شعر آ گیا ہے تو اس کی واضح طور پر نشاندہی کرتے گئے ہیں، مثلاً ردیف الدال میں حضرت حسانؓ کی نعت میں ایک شعر ہے:

وشق له من اسمه لیجله

فذو العرش محمود و هذا محمد ﷺ

اس پر البرقوقیؒ نے لکھا ہے:

”وهذا البيت ليس من قول حسان، وإنما هو لأبي طالب، ضمنّه حسان شعره“ (شرح برقوقی، ص۸۷، مطبعة الرحمانية بمصر ۱۹۲۹ء)

لیکن متذکرہ بالا شعر جو شرح البرقوقی کے ص ۲۹۲ پر موجود ہے، اس پر البرقوقی نے کوئی نوٹ نہیں لگایا، جس سے یہ شبہ ہو کہ یہ شعر کسی اور کا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ”معارف“ میں جو مضامین آج کل چھپ رہے ہیں وہ صرف مضمون نگار کا نام دیکھ کر چھپ رہے ہیں۔

ص۲۳ پر عنوان ہے ”اقبال کے شعری تکرار“، اس میں ”تکرار“ کو مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ دہلی کی ”فرہنگ آصفیہ“ اور لکھنؤ کی ”سعید اللغات“ دونوں میں ”تکرار“ کو مونث ہی لکھا ہے، خود اقبال کا یہ شعر موجود ہے:

”نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی
مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟“

اس میں اقبال مرحوم نے ”تکرار“ کو مؤنث استعمال کیا ہے، یہ تقریباً پوری غزل مجھے زبانی یاد ہے، ایک آدھ شعر اور دیکھیے اور لطف اٹھایئے:

تکلف تو تھا ان کو آنے میں قاصد
مگر یہ بتا طرزِ گفتار کیا تھی؟
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا
خطا اس میں بندے کی سرکار کیا تھی؟

(باقی آئندہ)

معارف: تکرار مکررات کے مفہوم میں اور تکرار بمعنی بحث کا فرق بھی واضح ہوجاتا تو بہتر تھا۔

جویائے خیر
ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

مکتوب علی گڑھ

(پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم)

سابق استاد شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف (اکتوبر ۲۰۲۰ء) میں ''وفیات'' کے تحت استادِ گرامی پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی مرحوم پر تعزیتی تحریر میں آپ نے ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے والد محترم کا ذکرِ خیر ''معلم و مربی'' کی حیثیت سے کیا کرتے تھے۔ مجھ جیسے ان کے بہت سے رسمی و غیر رسمی شاگردوں کا یہ احساس ہے کہ لائق و سعادت مند فرزند نے اپنے ابا جان سے سبق حاصل کرتے ہوئے یہ وصف اپنے اندر رچا بسا لیا تھا۔ حقیقت یہ کہ پہلے شعبۂ تاریخ اور بعد میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) میں تدریسی خدمات انجام دینے والے سابق صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی مرحوم کی شخصیت ایک استاد کی حیثیت سے مثالی رہی ہے۔ وہ ایک مشفق استاد ہونے کے ساتھ ساتھ مخلص مربی بھی تھے۔ درس و تدریس اور دیگر علمی کاموں میں سنجیدگی و انہماک ان کا وصفِ خاص تھا، وہ نظم و ضبط کے بہت پابند تھے اور طلبہ کو بھی اس کا پابند بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ استاد کی حیثیت سے ان کی ایک بہت ہی نمایاں خوبی طلبہ کی تعلیم و تربیت میں خصوصی دلچسپی تھی، انہیں ہر ممکن علمی تعاون دینے میں وہ خوشی محسوس کرتے تھے۔ اپنے شاگردوں کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور انہیں تحقیق و تصنیف کی عملی تربیت دینے میں وہ بڑی جانفشانی و فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے اور وقت کی قربانی دیتے تھے۔ مجھے اس کا ذاتی تجربہ ہے، شعبۂ تاریخ میں وہ میرے استاد رہے ہیں۔ اس شعبہ میں ریسرچ کی مصروفیات کے دوران مضمون یا مقالہ نگاری کی تربیت انہی کی مرہونِ منت ہے۔ بلا تکلف یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس میدان میں قلم پکڑنا انہی نے سکھایا۔ وہ میرے رسمی سپروائزر نہیں تھے، لیکن صورتِ حال یہ تھی کہ سیمینار و کانفرنس وغیرہ کے لئے انگریزی میں مقالہ کی تیاری کے دوران مرحوم کے مکان پر حاضر ہوتا تو اس کی تصحیح و تہذیب میں خوشی خوشی گھنٹہ، دو گھنٹہ صرف کر دیتے اور ذرا بھی اکتاہٹ یا ناگواری ظاہر نہ ہوتی۔ بلا شبہ اس طرح کے واقعات ایک ناچیز شاگرد کی تربیت اور اس کی ٹوٹی پھوٹی صلاحیتوں کو نکھارنے میں ایک مشفق استاد کی گہری دلچسپی کا واضح ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

استادِ مکرم یکم نومبر ۱۹۸۳ء کو شعبۂ اسلامک اسٹڈیز سے ریڈر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے، میں اکتوبر ۱۹۸۴ء کے آخر میں اِس شعبہ سے بحیثیت لکچرر منسلک ہوا۔ شکر الٰہی کہ ان سے استفادہ کی راہیں مزید ہموار ہوئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس شعبہ میں بھی میرے لئے ان کی حیثیت استاد و مربی کی ہی زیادہ رہی۔

تدریسی فرائض کی انجام دہی میں ان کے کلاس کے تجربات، منہجِ تدریس و اندازِ تربیت سے فائدہ اٹھاتا رہا اور یہاں بھی ان کی صحبتوں اور مجلسوں میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔ واقعہ یہ کہ آخر وقت تک ان سے فیضیابی کا سلسلہ جاری رہا۔

درس و تدریس میں مہارت، تدریسی فرائض کی دیانت داری کے ساتھ انجام دہی اور تحقیقی و تصنیفی کاموں سے گہرا شغف، فردِ واحد میں دونوں کے اجتماع کی مثالیں کم نظر آتی ہیں۔ واقعہ یہ کہ استادِ گرامی کی شخصیت اس پہلو سے بھی مثالی رہی ہے۔ استادِ مکرم کے تحقیقی ذوق کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے صحیح تحریر کیا ہے کہ "تحقیق کا عمل جیسے ان کے خمیر میں شامل ہو گیا اور اس کا سب سے بہترین اظہار سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مطالعہ اور نتائجِ مطالعہ کی شکل میں آیا"۔ بلاشبہ مرحوم نے قرآن، حدیث، سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، اسلامی تاریخ، عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ، سوانح و شخصیات مختلف موضوعات پر اپنے مطالعہ و تحقیق اور غور و فکر کے نتائج کتب و مضامین کی صورت میں پیش کئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تصنیف و تالیف کے میدان میں سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کا خصوصی موضوع تھا اور عامی زبان میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس موضوع کو انہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس سے متعلق ان کی کتابیں و مضامین اور ان کے خطبات و لکچرس کے مجموعے ان کی علمی یادگاروں کا سب سے قیمتی حصہ ہیں۔ اللہ کرے قرآن کریم اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق ان کا تحریری سرمایہ ان کے لئے ذخیرۂ آخرت بن جائے۔

قرآن کریم، حدیث اور سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر استادِ مکرم کی نگارشات کے بہت سے امتیازات میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر قرآن یا علمِ قرآن سے متعلق کسی موضوع پر اپنے مطالعات پیش کرتے تو حدیث سے اس کا ربط قائم کر دیتے تھے یا حدیثی تشریحات سے اسے مزین کرتے تھے۔ اسی طرح اگر حدیث یا سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پہلو پر اپنی تحقیقات و نتائجِ فکر کو تحریری شکل دیتے تو متعلقہ قرآنی آیات سے استشہاد کا اہتمام کرتے تھے۔ ماہنامہ معارف، سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی اور ششماہی علوم القرآن علی گڑھ اور دیگر رسائل و مجلّات میں شائع شدہ ان کے مقالات میں اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان کی حیات میں "تحقیقاتِ اسلامی" (جولائی۔ستمبر ۲۰۲۰ء) میں شائع ہونے والا ان کا آخری مقالہ (جنت میں داخلہ کی قرآنی ضمانتیں اور حدیثی تشریحات) بھی اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔

اللہ رب العزت ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، انہیں اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین! ثم آمین۔

والسلام مع الاکرام

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

ادبیات

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

بہت کچھ یوں تو دنیا بھر کے خوش گفتار کہتے ہیں
مگر ''سچ'' ہے وہی جو سید الابرارؐ کہتے ہیں

ہدایت اب جہاں بھی ہے، جہاں میں، فیض ہے اُنؐ کا
انہیںؐ کو ہم جہاں کا قافلہ سالار کہتے ہیں

دعائیں آپؐ نے دیں، زخم کھا کر اہل طائف کو
شرافت اس کو کہتے ہیں، اسے کردار کہتے ہیں

جہاں جبریل لاتے تھے، پیامِ خالقِ اکبر
انہیں دیوار و در کو مہبطِ انوار کہتے ہیں

جنہیں سن کر سکوں ہوتا ہے حاصل غم کے ماروں کو
وہ باتیں اب بھی طیبہ کے در و دیوار کہتے ہیں

نبیؐ کے جاں نثاروں ہی نے دنیا کو سنوارا تھا
مگر کچھ عقل کے اندھے گلوں کو خار کہتے ہیں

فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا صدیقؓ کی ہوگی
جنہیں سب سرور عالمؐ کا یارِ غار کہتے ہیں

عمرؓ کی راہ سے شیطان چلتا ہے الگ ہٹ کر
رسولِ پاکؐ خود یہ حرفِ جوہر دار کہتے ہیں

نبیؐ نے بارہا عثمانؓ کی تعریف فرمائی
غلط ہے، جو بھی کچھ، یہ بدہنجار کہتے ہیں

نہیں اس میں کوئی شک، بعد اصحاب ثلاثہ کے
علیؓ کو سب ہی علم و فضل کا مینار کہتے ہیں

رئیسؔ آقاؐ کی طاعت منتہائے دین و دانش ہے
خدا کی بندگی کا اس کو ہی معیار کہتے ہیں

قطعہ تاریخ وفات

دکتر مظفر حنفی

گہ گہی بودہ است شعلہ صفت
گاہ شبنم مظفر حنفی

شاعر شوخ طبع، شوخ نویس
ناثرِ خوش نگار، دست قوی

چوں بنا گاہ رفت از دنیا
دور شد از نگاہِ شخ و صبی

سالِ فوتش کہ از خرد جستم
بوفورِ فسوس و رنج دلی

باسر بادہ، ہم دوازدہ ''آہ''
بنوشتم ''مظفر حنفی''

۷۲=۱۲+۶

۱۳۶۸
۷۲
۲
۱۴۴۲ھ (۲۰۲۰ء)

نعمانی منزل، نزد ابوہریرہ مسجد، ہمدرد نگر-بی، (جمال پور) علی گڑھ، موبائل: ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷۔

نعت

جناب محمد حیات عامر حسینی

اے نوائے زندگی اے ساز زیست اے ردائے زندگی اے راز زیست
اے امام الانبیاء ختم الرسل اے رئیس عارفان مولائے کل
تو کہ نقش ہستی و تخلیق و رنگ تو کہ عکس رفعت و ساز و ترنگ
تو کہ ذکر و معنی اظہار زیست تو کہ فکر و پرتو انوار زیست
اے شفیع المذنبین شاہِ امم اے رئیس اصفیاء نور و کرم
اے کریم و مہربان و ضو فشاں اے پناہ انبیاء و مرسلاں
اے نوائے صادقانِ دل نشین اے ردائے عاشقانِ دل نشین
تو کہ اصل و معنی ام الکتاب تو کہ عکس مبدء دور حساب
تو کہ نقش و معنئ رقص وجود تو کہ عکس معنئ کشف و شہود
تو حدیث دلبری، ساز رواں پیش بین و مہ جبین و گل فشاں
یک نگاہ التفات و محترم اے پناہ مذنبین رشد و کرم
تو کہ رقص جاودانی می دہد تو کہ رمز ضو فشانی می دہد
بادشاہی گرد پائے پاک تو جاہ و شاہی گرد پائے پاک تو
دل شکستم پیش تو حاضر شدم من فقیرم پیش تو حاضر شدم
تاج و تخت حکمرانی می دہد ساز و بخت و زرفشانی می دہد
اے علاج بے کساں اے رمز حق اے حکیم دوجہاں روح شفق
یک نگاہ رحم کن برحالِ ما
یک نگاہ کرم کن برحالِ ما

پتہ: شعبۂ فلاسفی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

مطبوعات جدیدہ

قصیدے کی شعریات، مرتبین: پروفیسر شہپر رسول و پروفیسر وہاج الدین علوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۳۵۶، قیمت درج نہیں، پتہ: عرشیہ پبلی کیشنز، اے۔۱۷۰، گراؤنڈ فلور، سوریہ اپارٹمنٹ، دلشاد کالونی، دہلی۔۱۱۰۰۹۵

عربی، فارسی اور اردو میں قصیدہ کی صنف سے مشرقیات کا کوئی طالب علم نا آشنا نہیں، عرف عام میں بھی یہ لفظ متروکات میں شامل نہیں ہوا، لیکن بہ حیثیت صنف، اس کی تاریخ، اس کے ارتقائی مراحل، پھر عروج اور آخر میں اس کے زوال کا نئے انداز سے مطالعہ کا مطالبہ بھی ناوقت اور نامناسب نہیں، شاید اسی لیے جامعہ ملیہ کے شعبہ اردو سے یو جی سی نے قصیدے کے تحقیقی مطالعہ کو مرکزی موضوع بنانے کی خواہش کی تاکہ ایک بار پھر ایک قدیم تہذیبی روایت کی پرتوں کو تلاش کیا جائے۔ چنانچہ سمینار ہوا اور اپنے مقالات و اصحاب قلم کی موجودگی سے وہ کامیاب بھی ہوا، یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ شاید یہ اپنی نوعیت کا پہلا مذاکرہ علمی تھا، زیر نظر کتاب میں سمینار کے مقالات تو شامل ہی کیے گیے ہیں، کچھ بنیادی مباحث کا بھی انتخاب کیا گیا جیسے مولانا حالی، امداد اثر، ابو محمد سحر، محمود الٰہی، محمد حسن وغیرہ کی تحریریں، اشاریہ و قصائد اردو نے اس کتاب کی افادیت میں بڑا اضافہ کردیا اور آخر میں ولی، سودا، مصحفی، ذوق، مومن، غالب، امیر مینائی، محسن کاکوروی، حالی اور اقبال سہیل کے بعض قصائد کے انتخاب بلکہ حسن انتخاب نے کتاب کو گویا اپنے موضوع پر کامل و مکمل بنادیا، متنی اختصار کے حامل افتتاحیہ میں کہا گیا کہ غزل کی مقبولیت اپنی جگہ لیکن قصیدہ اور مثنوی کی بھی اہمیت ہے اور ان کے اصول و قواعد کے لیے کسی غیر تہذیب کے اصول و قواعد کی ضرورت نہیں، ظفر احمد صدیقی کا کلیدی خطبہ ہمیشہ کی طرح ان کے گہرے مطالعہ اور تجزیہ کا غماز ہے، البتہ وہ کہہ گئے کہ حالی کی طرح شبلی نے بھی استعماری فکر سے متاثر ہو کر کہیں کہیں فارسی قصیدے کی تخفیف کردی ہے، دلیل میں وہ پروفیسر نذیر احمد کی نظیر لائے ہیں لیکن اس میں کہیں استعماری فکر سے اثر پذیری کا ذکر نہیں ملتا، صدیقی صاحب یہ کہنے میں قطعی حق بجانب ہیں کہ اردو قصائد کا مطالعہ و تدریس ہماری تہذیبی شناخت کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، قاضی افضال حسین، چودھری آصف نعیم، انیس اشفاق سے شاہ فہد تک قصیدہ کے قریب ہر گوشہ پر مقالات ہیں اور بہت خوب ہیں، فارسی قصائد کا پس منظر اور اردو قصیدہ نگار کے عنوان سے آصف نعیم کے مقالہ میں شعرالعجم اور شبلی کے حوالہ سے کہا گیا کہ قصیدے کے تدریجی ارتقا پر اپنی تمام کمیوں کے باوجود شبلی کا تبصرہ بے حد نکات انگیز

ہے، ان کا یہ جملہ بھی ان کے مطالعہ کی وسعت ظاہر کرتا ہے کہ رضا زادہ شفق یا ذبیح اللہ صفا یا سیروز شمیسا یا احمد تمیم داری یہ شبلی کی طرح نکات انگیز نہیں اور نہ ہی اسلوب شناسی میں شبلی سے زیادہ شعریات ساز۔ ارمان نجمی نے یہ بات خوب کہی کہ قصیدے تو نہیں رہے لیکن اس کی ہیئت میں حمدیہ ونعتیہ اور بعض سیاسی نظمیں اس کی یاد دلاتی ہیں، خصوصاً اردو نظم پر اس کی پرچھائیں صاف نظر آتی ہے۔ ایک تحریر سب سے آخر میں ہے لیکن قصیدہ اور غزل کے صنفی امتیازات وافتراقات کے پہلوؤں پر شاید یہ تحریر بہتوں کی تحسین کی مستحق قرار پائے۔

عصر حاضر کے امام العالم وقائد اعلیٰ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، از جناب احمد ابوسعید،
قدرے بڑی تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، مجلد، صفحات ۶۸۰، قیمت ۵۰۰ سو روپے، پتہ:
اردو بک ریویو، دریا گنج، نئی دہلی اور شان پبلی کیشنز، طاہر ولا، یوسف گوڑہ، حیدر آباد-۴۵۔

کتاب کا پورا نام باقی رہ گیا، مذکورہ عنوان کے ساتھ دوسری سطر میں درج ہے،''حیات وخدمات ماہ وسال کے آئینہ میں'' اپنے عنوان سے اس درجہ انصاف کرنے والی کتابیں کم ہی ملتی ہیں، مولانا مودودی کی زندگی کا سفر ۱۹۰۳ء سے شروع ہوا، ۱۹۷۹ء میں انہوں نے حیات مستعار کی مدت پوری کی، اس پورے عرصہ کو ہر سال کی تحدید وتعیین کے ساتھ بیان کرنا واقعی آسان نہیں مگر جب سوانح نگار محض محقق نہ ہو، غایت درجہ محب ومعتقد ہو تو ہر مشکل آسان ہو ہی جاتی ہے، انوکھا پن دیکھیے کہ 'عمر۔ ایک سال' کے تحت پیدائش، قیام اورنگ آباد، والدین کی دینی کیفیت کو بیان کیا گیا، اسی طرح ہر سال کے اہم اور غیر اہم واقعات کو ایک ترتیب میں پرو دیا گیا، مصنف کوئی پیشہ ور صاحب قلم نہیں، ان کی زندگی کا خارجی حصہ کسب معاش کا عنوان لیے ہے، لیکن دنیائے دوں سے الگ جہان اندرون میں صرف ایک ہی تصویر ہے اور وہ ان کے ممدوح مولانا کی ہے، ایسی محبت وعقیدت اور تعلق کی ایسی سرشاری بلکہ جاں نثاری پرانے تذکروں میں مشائخ اور ان کے مریدین اور ائمہ کرام اور ان کے بعض متبعین میں ضرور ملتی ہے، بس وہی مناظر اس کتاب کے صفحات میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں، مولانا مودودی کی کتاب زیست کی ہر تحریر کو آنکھوں سے دل تک اتارنے اور بسانے کے عمل میں کوئی ان کا ہمسر نظر نہیں آتا، تفہیم القرآن کی تلخیص، ترجمان القرآن العظیم وغیرہ ان کی کئی کتابیں ہیں مگر حیات مودودی پر یہ کتاب ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے، اصلاً کئی سال پہلے انہوں نے ''بیسویں صدی کا قائد اعلیٰ'' کتاب مرتب کی تھی، اس کے تین ایڈیشن نکلے، اس مقبولیت سے ان کو زیر نظر انوکھی کتاب کی

تالیف کی ہمت ہوئی، ان کو علم ہے کہ مولانا مودودی پر کم و بیش ڈیڑھ سو کتابیں لکھی جا چکی ہیں، اس لیے کام کی انفرادیت اور جدت ان کے مدنظر رہی اور اس حوصلہ کو طاقت مولانا مودودی کے ان الفاظ سے ملی کہ اگر کوئی نیا کام قارئین کی اس ضرورت کو پورا کرے جو اور کتابوں سے پوری نہ ہوئی تب تو ٹھیک ہے ورنہ کیے ہوئے کام پر کوئی نیا کام یا کتاب کی اشاعت، وقت اور محنت کا صحیح مصرف نہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب اپنے وجود کا جواز ہی نہیں ضرورت بھی ثابت کرتی ہے، البتہ عقیدت کب غلو بن جائے اور مداحی کہاں مدلل ہو جائے، یہ الگ سوالات ہیں، مثلاً یہ کہنا کہ ''بہر حال حیات سید ابوالاعلیٰ مودودی، قرآن مجید، سیرت رسولؐ اور صحابہؓ کی اتباع کی عملی تصویر ہے''، یا کسی کی ایسی عبارت کی داد دینا کہ ''نام ابوالاعلیٰ، بندہ باری تعالیٰ، دارا و سکندر سے یہ مرد فقیر اعلیٰ، بندہ خاکی مگر جبریلؑ کا ہم سایہ......'' یا یہ عنوان کہ ''ایک طرف تن تنہا سید مودودی، دوسری طرف تاریخ کے سارے فتنے'' پوری کتاب میں بس یہی کیفیت طاری ہے، قصیدے کی شعریات کا ذکر اوپر آیا، یہ کتاب قصیدے کی نثریات کا در بھی کھولتی نظر آتی ہے۔ بہر حال اپنے موضوع پر یہ کتاب دیگر معلومات کے اعتبار سے بھی بڑی جامع ہے اور یہ ضمیموں کی شکل میں ہے، آخر میں اہم اور تاریخی تصویروں کا ایک گلدستہ بھی ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی، علمی و ادبی خدمات، مرتبہ مولانا طلحہ نعمت ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۰، قیمت درج نہیں، پتہ: امجد پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، ۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر ۹۷۰۸، جامعہ نگر، نئی دہلی-۲۵۔

علامہ سید سلیمان ندوی کی ذات والا صفات پر کئی نہایت وقیع سیمینار، بھوپال، پٹنہ، دہلی جیسے شہروں میں ہوئے لیکن مولانا کے وطن دیسنہ اور اس کے آس پاس کی بستیوں میں سید صاحب کے عقیدت مندوں کی تمنا تھی کہ گو اب پہلی سی رونق نہ سہی، بے سروسامانی ہی میں سید صاحب کی یاد میں کچھ ساعتیں نکالی جائیں، اس کے لیے ایک ہونہار اور سعید و صالح نوجوان مرتب نے اپنی ذاتی تگ و دو سے بہار شریف میں فرصت نکال ہی لی، کہنے کو تو یہ چند گھنٹوں کا پروگرام تھا لیکن سید صاحب کے خلف الرشید ڈاکٹر سلمان ندوی کی شرکت نے اس کی وقعت میں بڑا اضافہ کر دیا، ان کے علاوہ پروفیسر احمد سجاد، پروفیسر محمد حسان خاں بھوپالی، ڈاکٹر سید راشد نسیم، مولانا طلحہ ابوسلمہ، مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، ڈاکٹر سید ارشد اسلم، مولانا ڈاکٹر سید عبدالواحد ندوی وغیرہ نے اپنے مقالات و گفتگو سے سیمینار کو معیار

بخش دیا، مقالوں کے علاوہ سب سے دلچسپ اور معلومات افزا، خطبہ استقبالیہ تھا جس میں بہار شریف کے پورے علاقہ کے تاریخی و علمی اور سماجی حالات تفصیل سے آگئے، کتاب مختصر ضرور ہے لیکن سید صاحب کے شیدائیوں کے لیے اس میں بہت کچھ ہے، مضامین کے علاوہ دیسنہ کی کچھ تصویریں ہیں: دیکھے انہیں جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

گیتا حقیقت کے آئینہ میں از: وی، آر، نارلا، مترجم: جناب سید شاہد، متوسط تقطیع، کاغذ وطباعت مناسب، صفحات ۱۶۴، قیمت ۹۰ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز، بی۔۳۵، (LGF) نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔۱۳۔

برادرانِ وطن کی مذہبی کتابوں میں گیتا بھی مقدس کتاب کا درجہ رکھتی ہے، یہ ویدوں کی طرح ان کے عقیدہ میں آسمانی تو نہیں ہے لیکن کرشن اور ارجن کے درمیان اس گفتگو پر مشتمل ہے جو مہابھارت کے عرصۂ جنگ میں ہوتی رہی، کرشن کا درجہ اوتار یا بھگوان ہی کا بتایا جاتا ہے، برادران وطن کی اس کتاب کے معتبر ہونے یا نہ ہونے سے کم از کم مسلمان محققوں نے زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کی، اس لیے کبھی یہ سوال بھی ان محققوں کے دل ودماغ میں نہیں آیا کہ کیا گیتا واقعی مہابھارت کی دین ہے؟ لیکن خود ہندوؤں میں تحقیق کا عمل جاری رہا، یہ کتاب بھی جنوبی ہند کی ایک مشہور شخصیت کے قلم سے ہے، جنھوں نے اس کے علاوہ انگریزی اور تیلگو میں قریب تیس کتابیں لکھی ہیں اور ان کے ترجمے بھی شایع ہوئے، یہ کتاب حیدرآباد سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی اور خدا بھلا کرے اس کے اردو مترجم اور ناشر کا کہ ایک بہت دلچسپ، چشم کشا اور معلومات سے لبریز کتاب کے مطالعہ کا موقع مل گیا، اب کیا بتائیں کہ اس مختصر سی کتاب میں کیا کیا نہیں ہے، مہابھارت کی حقیقت کو عظیم مجرمانہ دھوکہ، کرشن کی حقیقت، فرضی واقعات، فرضی تاریخیں، گیتا کی اخلاقیات وعمرانیات، قبائلی بھگوان سے قومی بھگوان تک ایسے مباحث ہیں جن کو تاریخ اور عقل دونوں کی کسوٹی پر رکھ کر جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ ”رجل منھم“ ہی کے بس کی بات ہے جو یہ کہتا ہے کہ موجودہ ذہن کو عقیدہ سے ضد ہی نہیں بلکہ ایسے اوہام وخرافات سے نفرت ہے، جو مشکوک ہے اسے مشکوک ہی سمجھنا ہوگا، ہم یہاں ان باتوں کا ذکر نہیں کر سکتے جن سے اس کتاب کا کورکشتیر ایک بدنام شاستر میں بدلتا نظر آتا ہے، بہر حال تقابل ادیان کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والوں کے لیے اس کتاب میں اہم معلومات کی کمی نہیں۔ (ع۔ص)

رسید کتب موصولہ

اسلامی بینک: ڈاکٹر محمد یوسف، نیو مالے پلی، حیدرآباد (تلنگانہ) قیمت ۱۵۰ روپے

امیجری کا زوال: ڈاکٹر محمود شیخ، مکتبہ جامعہ اردو بازار، دہلی۔ قیمت ۱۵۰ روپے

ٹریکل ڈاؤن اکنامکس: ڈاکٹر محمد خالد بلوروز امیزون فلپ کارڈ۔ قیمت ۱۹۹ روپے

حروف بازگشت: کلیم صفات اصلاحی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ قیمت ۱۸۰ روپے

حریم لفظ ومعانی: ظہیر حسن ظہیر، مکتبہ الفہیم مئوناتھ بھنجن (یو۔پی) قیمت ۲۵۰ روپے

حیات مورخ اسلام: جمع وترتیب مولانا نعیم الاسلام قادری ومولانا محمد احسان شمسی، علیگ، بیت الحکمت، کریم الدین پور، گھوسی، مئو۔ قیمت ۴۰۰ روپے

کلام شبلی کے اعلام واشخاص: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی قیمت ۲۵۰ روپے

مضامین یوسف: ڈاکٹر محمد احتشام الدین خرم، نیو مالے پلی، حیدرآباد قیمت ۲۰۰ روپے

مولانا عبدالماجد دریابادی (یادوں کے آئینہ میں): مولانا عبدالباری اثری، ترتیب ارشد علی انصاری اعظمی، گہوارۂ ادب، محلہ کائستھ ٹولہ محمد آباد، گوہنہ، ضلع مئو۔ قیمت ۲۵۰ روپے

ہندوؤں، مسلمانوں میں دھارمک سماجک پنرجاگرن: ڈاکٹر بی۔این۔گوڑ، اعظم گڑھ۔ قیمت ۱۲ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	175/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	220/-
شعر العجم اول	300/-
شعر العجم دوم	150/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	200/-
شعر العجم پنجم	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	250/-
علم الکلام	200/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		250/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		100/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		200/-
کلیات شبلی (اردو)		220/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		170/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبد السلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
اسلام اور مستشرقین چہارم (علامہ شبلی کے مقالات)		250/-

ISSN 0974 - 7346 Ma'arif (Urdu) -Print
NOVEMBER 2020 Vol - 206 (5)
RNI. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022
Monthly Journal of
Darul Musannefin Shibli Academy
P.O.Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P. (India)

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

۱۔	سیرالصحابہ اول	حاجی معین الدین ندوی	300/-
۲۔	سیرت عائشہؓ	مولانا سید سلیمان ندوی	220/-
۳۔	حیات شبلی	مولانا سید سلیمان ندوی	650/-
۴۔	تذکرۃ الفقہاء اول	مولانا عمیر الصدیق ندوی	150/-
۵۔	مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	240/-
۶۔	حکیم الامت۔نقوش وتاثرات	مولانا عبدالماجد دریابادی	400/-
۷۔	علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	180/-
۸۔	تاریخ اسلام (اول ودوم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	370/-
۹۔	تاریخ اسلام (سوم وچہارم) مجلد	شاہ معین الدین احمد ندوی	500/-
۱۰۔	تاریخ دولت عثمانیہ اول	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۱۔	تاریخ دولت عثمانیہ دوم	محمد عزیر (علیگ)	300/-
۱۲۔	تاریخ ارض القرآن (اول ودوم)	مولانا سید سلیمان ندوی	375/-
۱۳۔	تاریخ اندلس اول	سید ریاست علی ندوی	350/-
۱۴۔	تاریخ اندلس دوم	سید ریاست علی ندوی	220/-
۱۵۔	تاریخ اندلس سوم	سید ریاست علی ندوی	300/-
۱۶۔	مطالعہ مذاہب کی اسلامی روایت	محمد سعود عالم قاسمی	300/-
۱۷۔	عہداورنگ زیب میں علما کی خدمات	ڈاکٹر علاء الدین خاں	380/-
۱۸۔	تعلیم عہد اسلامی کے ہندوستان میں	ظفرالاسلام اصلاحی	100/-
۱۹۔	آثارِ شبلی	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	500/-